فکرِ اقبال کا ترجمان

میرا پیام

(۱۶)

مدیر

پروفیسر **عبدالحق**

معاون مدیر

ڈاکٹر سرفراز جاوید، ڈاکٹر محمد شاہد خاں

اقبال اکیڈمی (ہند) نئی دہلی

میرا پیام

جملہ حقوق محفوظ

ناشر : اقبال اکیڈمی (ہند)، نئی دہلی

اشاعت : ستمبر ۲۰۲۲ء

پریس : اصیلا پریس نئی دہلی

قیمت : سو روپیے

MERA PAYAM

Iqbal Academy (India)

Cisrs House,14 B.Jangpura

Mathura Road, New Delhi 110007

September 2022

ترتیب

ڈاکٹر سید ظفر محمود	حرفِ آغاز	4
پروفیسر عبدالحق	عرضِ حال	5
ڈاکٹر سید ظفر محمود	سرسید کو خراج عقیدت	6
پروفیسر عبدالحق	معراجِ رسول فکرِ اقبال کا محرکِ تخلیق	13
پروفیسر عبدالرحیم قدوائی علی گڑھ	کلامِ اقبال کی آفاقیت	27
ڈاکٹر طاہر حمید تنولی، لاہور	علامہ اقبال کے پہلے خطبہ کے اہم نکات	38
ڈاکٹر مشتاق احمد گنائی سری نگر	اقبال کے فکر و فن میں جدید سائنسی ،اخلاقی اور روحانی تصورات: ایک تحقیقی جائزہ	46
ڈاکٹر رؤف خیر حیدر آباد	حق و ناحق کے درمیان اقبال	60
ڈاکٹر سرفراز جاوید	ڈاکٹر عامر محمود (اسلام آباد) کے تحقیقی مقالے پر ایک نظر	66
ڈاکٹر محمد مرتضٰی	اقبال کا پیغام نئی نسل کے نام	72
تبریک و تبصرے		
پروفیسر عبدالحق	تقدیم	81
// //	تیرا وجود الکتاب	89
// //	تبریک و تحسین	91
// //	تصوراتِ اقبال	93
حافظ محمد اختر	اقبال کے فکر و فن کا گراف	98

حرفِ آغاز

تاخیر کے لیے معذرت خواہ ہوں ۔ اپنی بساط بھر کوشش کے باوجود حالات کی ناخوش گواری حائل رہی ، جریدے کا سولہواں شمارہ قارئین کرام کو پیش کرتے ہوئے سرخرو ہونے کا احساس ہو رہا ہے ۔ دنیا دُہرے آشوب کی زد میں ہے ۔ معاش و معیشت کے ساتھ علم و ہنر بھی کئی طرح کے بحران سے دوچار ہوئے ۔ ان حالات میں انسانی نفسیات کا متاثر ہونا یقینی ہے مگر نظم عالم کا جاری رہنا بھی تکوینی نظام کا لازمی حصہ ہے ۔ بقول اقبال:

ابھرتا ہے مٹ مٹ کے نقشِ حیات

ہماری تگ و دو بھی اسی طرح جاری رہے تو اچھا ہے ۔ اس دور انیے ادارہ دوسرے کاموں میں بھی مصروف رہا ۔ قارئین کرام سے بہتر سے بہتر رابطے کی تلاش جاری ہے ۔ خاص طور پر اساتذہ و تلامذہ کے ساتھ مراسم پر توجہ دی گئی اور خاطر خواہ کامیابی بھی ملی ۔ ان کے محسوسات پر لائحہ عمل تیار کیا گیا اور شریک کار بنانے پر غور و فکر کے بعد منصوبے بھی منصوبے تیار کیے گئے ۔ مطالعۂ اقبال کے حلقے میں اضافہ سے بڑی تقویت حاصل ہو رہی ہے ۔ مرحلۂ شوق کو منزل تک پہنچانے میں آپ کے تعاون کے لیے پُر امید ہوں ۔

سید ظفر محمود

عرضِ حال

ربِّ کریم کا بڑا احسان ہے کہ نامساعد حالات میں بھی اس نے ہراساں نہ ہونے دیا۔ شکوۂ تقدیر ہو یا تاخیر کا کوئی جواز نہیں۔ ہم ہی قصوروار تھے۔ شائقینِ اقبال نے سرگرم کار رہنے پر مجبور کیا۔ راقم ان کی بے پایاں محبتوں کا شکرگزار ہے ان کے متواتر تقاضوں نے نیا عزم پیدا کیا۔ یہ شمارہ قارئین کے اسی جذب وشوق کو نذر ہے جو راقم کے لیے جاں فروز ہے اور دل کشا بھی۔ اقبال کی شاعری جہاں آشوب نغموں کے آہنگ سے معمور ہے وہ ارض وسما کے ہنگاموں میں جینے کا سلیقہ سکھاتی ہے اور فکر وعمل سے نئی دنیا تعمیر کرنے کا حوصلہ بخشتی ہے، کرۂ ارض پر نادانوں کی کج فکری نے نوع انسان کو طرح طرح کے مکروفسوں میں مبتلا کیا ہے۔ مطالعہ ومشاہدات بھی اس کی زد میں ہیں۔ اس فسوں کو توڑنے کے لیے ربِّ جلیل سے قوت وشوکت کی طلب ضروری ہے۔ اس کا حصول اقبال کے فکر و پیغام کا مرکزی نقطہ ہے۔ علامہ اس سے خالی امامت و نیابت کو برگِ حشیش کہتے ہیں۔

یہ فکر وفرزانگی کے لیے بھی نسخۂ شفا ہے۔ اس شمارے میں متعدد مضامین میں اس کی یافت کے اشارے موجود ہیں۔ ڈاکٹر طاہر حمید تنولی کا مضمون خطبات اقبال کے حوالے سے بے حد فکر انگیز اور دل فروز ہے۔ پروفیسر عبدالرحیم قدوائی کا مقالہ نئی جہت کی تلاش ہے۔ اور مغرب کے اقبال شناسوں کی قدر شناسی ہے۔ ڈاکٹر مشتاق احمد گنائی نے اقبال کے روحانی اقدار پر روح پرور گفتگو کی ہے۔ ڈاکٹر رؤف خیر، ڈاکٹر سرفراز جاوید اور ڈاکٹر محمد مرتضیٰ جیسے ذی علم قلم کاروں کی کاوش کے لیے ادارہ ممنونِ کرم ہے۔ یقین ہے کہ یہ شمارہ بھی پسند کیا جائے گا اور ادارے سے قارئین کے رشتے میں مزید استواری پیدا ہوگی۔

عبدالحق

ڈاکٹر سید ظفر محمود

سرسید کو خراج عقیدت: تعلیمی ادارہ سازی و سماجی بندوبست

وقت اور زمین و جائداد کا صدقہ کیجئے

فی الوقت ہم ملک کی سیاسی اُفق پر بے قرار ہیں پھر بھی ہمیں اس ایمانی مفروضہ پر یقین محکم رکھنا ہے کہ 'ہر تنگی کے ساتھ آسائش ہے'۔ علی گڑھ مسلم یونیورسٹی سے متعلق ہم ملک و دنیا میں خوب پر جوش محفلیں آراستہ کرتے ہیں' مکالمے منعقد کرتے ہیں' اخبارات میں مضامین لکھتے پڑھتے ہیں' بھلا ہو وائس چانسلر ڈاکٹر طارق منصور کا کہ صدر جمہوریہ' وزیر اعظم و وزیر تعلیم بھی ہماری خوشیوں میں شامل ہوتے رہے ہیں۔ لیکن ہمیں یہ بھی غور کرنے کی ضرورت ہے کہ ہم نے خود انفرادی و اجتماعی طور پر سرسید کا قرض کتنا ادا کیا ہے؟ ہم نے کتنی ذاتی تگ و دو کی ہے ملت کی فلاح و بہبود کیلئے؟ قرآن کریم میں اللہ نے بتایا ہے کہ انسانیت کی تخلیق اس لئے کی گئی ہے کہ پروردگار فیصلہ کرے کہ ہم میں سے کون زیادہ انہماک سے اس کی مخلوق کی زندگی بہتر بنانے کی جد و جہد میں لگا رہا۔ یہ کہ ہمارا پیدا کرنے والا خود ہمیشہ کام میں مصروف رہتا ہے اور اس نے اپنی روح ہمارے اندر پھونکی ہے' لہٰذا ہمیں اس کے اوصاف میں سے اپنا حصہ لے لینے کی کاوش میں لگے رہنا چاہئے۔ یہ کہ کائینات ابھی نا تمام ہے اور ہر جانب سے کن فیکون کا ورد ہمارے کانوں میں گونج رہا ہے۔ لہٰذا کوئی بڑا کام کرنے کے لئے ہمارا سکندر ہونا ضروری نہیں' بلکہ ہمارے سینہ میں تمام سامان موجود ہے اور ہم اپنا آئینہ خود بنا سکتے ہیں۔ ہمیں اپنے من میں ڈوب کر زندگی کا سراغ تلاش کرنا ہے۔ اگر ہم محفل میں شریک ہی نہیں ہوں گے تو قصور تو ہمارا ہی ہوا نا۔ ہماری جنت ہمارے سوز جگر میں پنہا ہے۔ ہماری ہستی دانا و توانا ہے اور ہم اپنے چمنستان کی ہیئت ضرور بدل سکتے ہیں۔ کچھ اہل وطن غلط فہمی میں ہیں کہ ہماری کشتی بھنور میں ہے ایسا ہرگز نہیں ہے' وہ موجیں تو دراصل ہمارے عزم کا طواف کر رہی ہیں۔ اس ظلمتِ شب میں سے ہم اپنے درماندہ کارواں کو لے کے ضرور نکلیں گے۔ ہاں اب صرف چشم کو نم کرنے اور جان کو شوریدہ کرنے سے کام نہیں چلے گا اور ملت

سے ہمارا پوشیدہ عشق اب کافی نہیں ہے بلکہ اب تو ہمیں بازار میں پابجولاں چلنا ہوگا۔

سرسید احمد خاںؒ (1817-1898) ایسے زمانہ میں پیدا ہوئے تھے جب مملکت برطانیہ نے ایسٹ انڈیا کمپنی کی مدد سے علاقائی سازش وسرکشی کے ذریعہ مغلوں کی وسعت وطاقت کو محدود کر دیا تھا۔ موقع کی نزاکت کے لحاظ سے انھوں نے خود کمپنی کے کالج میں تعلیم حاصل کی اور عدل وقانون میں ڈگری حاصل کی۔ جدید سائنسی تعلیم کو فروغ دینے کے لئے تعلیمی ادارے قائم کرنے کے ساتھ مسلم تاجروں اور کاروباریوں کو سرسید نے منظّم بھی کیا۔ انھوں نے اُس وقت مسلم سماج میں رائج جہالت، غیر عقلی اعتقاد اور ناکارہ رواجوں کی مخالفت کی۔ 1857 کی بغاوت کے بعد انھوں نے ایک کتابچہ لکھا تھا بہ عنوان 'اسباب بغاوت ہند' جس میں انھوں نے انگریزوں کی پالسی کی تنقید کی اور کمپنی پر زور دیا کہ انتظامیہ میں مسلمانوں کو شامل کیا جائے۔ حالانکہ ان کے دوستوں نے رائے دی کہ اس کتابچہ کے سب نسخے جلادئے جائیں ورنہ سرسید کو ذاتی نقصان پہنچ سکتا ہے لیکن سرسید نے کہا کہ اگر ایسا ہوتا ہے تو بھی مسلمانوں کو اس کا فائدہ پہنچے گا اور انھوں نے اللہ کے علاوہ کسی اور سے خوف نہ کرنے کا اعلان کرتے ہوے اس کتابچہ کے 500 نسخے برطانوی حکومت و پارلیمنٹ کو بھیج دئے۔ وہاں اس کا انگریزی میں ترجمہ کروایا گیا اور اس پر بحث ہوی اور پھر معمولی مخالفت کے بعد گورنر جنرل نے اس کتابچہ کو ایک مخلصانہ ودوستانہ رپورٹ کے طور پر تسلیم کرلیا اور اس کی بنیاد پر برطانوی پالسی میں تبدیلیاں بھی کی گئیں۔

سرسید نے انگلستان کی رائل سوسائٹی اور رائل ایشیاٹک سوسائٹی کی طرز پر علی گڑھ میں سائنٹفک سوسائٹی قائم کی۔ اس کے ذریعہ سالانہ کانفرنس کا انعقاد ہوتا تھا، تعلیمی اداروں کے لئے فنڈ دیا جاتا تھا اور سائنس کے مضامین کا ایک جریدہ شائع کیا جاتا تھا۔ انھوں نے 'تہذیب الاخلاق' کے عنوان سے رسالہ شائع کرنا شروع کیا، حضور اقدسؐ کی حیات طیبہ پر مضامین لکھے اور اسلامی اصولوں کا سائنس وترقی یافتہ سیاسی خیالات سے موازنہ کیا۔ سرسید نے 1887 میں محمڈن سول سروسز فنڈ ایسوسیشن قائم کی جس کے 500 رکن تھے اور ہر شخص سالانہ 2 روپئے دیتا تھا جو رقم کافی ہوتی تھی 15 نوجوانوں کو ہر سال لندن بھیجنے کے لئے جہاں وہ سول سروس کے امتحان میں شریک ہوتے تھے۔ انھوں نے تجویز دی کہ مسلمان آپس میں گفت وشنید کرنے کے لئے اردو زبان کا استعمال کریں۔ 41-1840 میں شائع شدہ ان کی کتاب 'آثار الصنادید' میں سرسید نے دہلی میں مقیم قدیم یادگاری عمارتوں کی تفصیل بیان کی۔ علی گڑھ میں محمڈن اینگلو اورینٹل اسکول قائم کرنے سے پہلے مرادآباد اور غازی پور میں بھی تعلیمی ادارے قائم کئے۔ بعد ازاں علی گڑھ کا ادارہ 1920 میں برطانوی پارلیمنٹ کے ایک خصوصی ایکٹ کے تحت مسلم یونیورسٹی بن گیا۔

سرسید کی روح کو تقویت پہونچانے کے لئے ہم میں سے جس جس کے پاس انفرادی یا تنظیمی سطح پر زمین یا جائداد ضرورت سے زائد ہو انھیں اس کا کچھ حصہ کسی رجسٹرڈ ٹرسٹ کے نام منتقل کر کے وہاں تعلیمی ادارے قائم کر دینے چاہئیں۔ ڈاکٹر خواجہ حامد شاہد کی زیر صدارت آل انڈیا مسلم ایجوکیشنل کانفرنس کی طرز پر ملک میں جگہ جگہ مسلم تعلیمی کانفرنس کا انعقاد ہونا چاہئے' مسلم یونیورسٹی سے شائع ہونے والے رسالہ 'تہذیب الاخلاق' کا زیادہ دیگر زبانوں میں ترجمہ شروع کر کے اس رسالہ کو ملک کے مختلف علاقوں کے طول وارض میں تقسیم کیا جانا چاہئے۔ مسلم یونیورسٹی کے سول سروسز کے ادارہ کا ایک کیمپس دہلی میں بھی ہونا چاہئے کیونکہ سول سروسز کی کوچنگ کے لئے ملک کے کامیاب ترین کوچ صاحبان سب دہلی میں ہی ہیں۔ دہلی کیمپس میں ڈائرکٹر کی تعیناتی کے لئے سول سروسز میں کام کرنے والے کسی سینئر آفسر کی خدمات کو ڈپیوٹیشن پر حاصل کیا جانا چاہئے۔

پوربی اتر پردیش کے ضلع بہرائچ میں شہر سے تقریباً 13 کلومیٹر دوری پر تحصیل مہسی کے گاؤں میگلا میں 1954 سے مسلم یونیورسٹی کو جناب سنت رام چودھری سے تحفہ میں ملی ہوی 140 ایکڑ زمین ابھی تک غیر مستعمل پڑی ہوی ہے۔ بھلا ہو بہرائچ کی ہیومن ولفیئر سوسائٹی کے جنرل سکریٹری ڈاکٹر وجود خاں کا کہ انھوں نے تگ ودو کر کے ضروری کاغذی کاروائی کو کسی حد تک آگے بڑھایا۔ انھوں نے مسلم یونیورسٹی کے انتظامیہ کی منظوری کے تحت آل انڈیا آیوش ٹیچرس ایسوسیشن کے صدر ڈاکٹر عبداللہ خاں اور علامہ اقبال ایجوکیشنل سوسائٹی کے ممبر ڈاکٹر داور صدیقی کے ساتھ مل کے اس زمین پر مسلم یونیورسٹی کا سائن بورڈ لگا دیا' اس موقع پر گرام پردھان کامتا پرساد سونکر و دیگر اشخاص موجود تھے۔ راقم الحروف نے یونیورسٹی انتظامیہ سے گفتگو کر کے وہاں کے لئے ایک مقامی کمیٹی تشکیل کروا دی ہے' جس میں یونیورسٹی کے رجسٹرار و فائینانس آفسر اس کی نمائندگی کرتے ہیں۔ علیگ خواتین وحضرات و دیگر بہی خواہان ملت کا فریضہ ہے کہ اس کار خیر میں آگے بڑھ کے حصہ لیں۔ بہرائچ شہر میں یونیورسٹی کے توسیعی دفتر کے لئے فوری طور پر زکوٰۃ فاؤنڈیشن آف انڈیا وہاں اپنے زکوٰۃ ہاؤس کیمپس میں جگہ وسہولت مہیا کر سکتا ہے۔ بہتر ہوگا کہ بہرائچ میں اپنے تعلیمی ادارہ کے لئے علی گڑھ مسلم یونیورسٹی اپنا ایک اکاؤنٹ اسٹیٹ بینک آف انڈیا' بہرائچ کی مین برانچ میں کھول دے۔

سرسید کی تحریک سے اثر انداز ہو کر انھیں جیسی کار کر گذاری کرنے والوں کا بھی ذکر کیا جائے تا کہ اگلی نسلوں میں اس زمرہ میں اشخاص وخاندانوں میں اضافہ ہوتا رہے۔ علی گڑھ میں سرسید کے ذریعہ 1875 میں قائم شدہ محمڈن اینگلو اورینٹل کالج کے تنے سے پھوٹنے والی کونپل یعنی جامعہ ملیہ اسلامیہ سے تو پورا ملک خوب واقف ہے' وہاں کی موجودہ وپہلی خاتون وائس چانسلر پروفیسر نجمہ اختر بھی دلجوئی سے ادارہ کو نئی اونچائیوں تک لے جانے کی کاوشوں میں

لگی ہوی ہیں۔ پھر بھی سرسید کی تحریک سے بلا واستہ تاثرانہ دم کشی لے کر بیسویں صدی کے دوران مزید یونیورسٹیاں قائم کرنے والوں کولوگ کم جانتے ہیں۔ جب 1947 کے دوران ہر طرف قتل وغارت کا ماحول تھا تب پدم شری حکیم عبدالحمید دہلی میں زمین خرید رہے تھے جس پر ہمدرد فاؤنڈیشن نے درجنوں تعلیمی وتحقیقی ادارے قائم کئے اوراب وہ سب ادارے عموماً ہمدرد یونیورسٹی یا ہمدرد فاؤنڈیشن کے تحت رواں دواں ہیں' اس تگ ودو میں چانسلر سید حامد کا بہت مثبت رول رہا' اللہ دونوں کوغریق رحمت کرے۔ پونہ کے پی اے انعامدار وبیگم عابدہ انعامدار نے اعلیٰ کارکردگی کر کے وہاں کے اعظم کیمپس کو یونیورسٹی کا درجہ دلوادیا۔لکھنو کی انٹگرل یونیورسٹی کے بانی چانسلر وسیم اختر کا شاہکار قابل ستائش ہے' انھوں نے لکھنو کے ندوۃ العلماء اور دہلی کے مظہر العلوم واینگلوعربیک اسکول سے شروعاتی تعلیم کے بعد جامعہ ملیہ اسلامیہ' لکھنو یونیورسٹی اور حیدرآباد سے جدید ڈگریاں حاصل کیں' لکھنو میں کچھ وقفہ الہدیٰ اسکول میں پرنسپل رہ کر پھر وہیں ٹکنو اکیڈمک اسکول قائم کیا اور تب سے پیچھے مڑ کے دیکھنے کی راہیں اپنے لئے بند کرلیں' لکھنو کے علاوہ اب شاہجہاں پور میں بھی انٹگرل یونیورسٹی کا ایک کیمپس ہے۔

آسام سے متصل میگھالیہ کی یونیورسٹی آف سائنس اینڈ ٹکنالوجی کو قائم کرنے والے گواہاٹی کے محبوب الحق شرعی پوشاک کے پابند و پرنور چہرہ کے مالک ہیں۔انھوں نے آسام کے ضلع کریم گنج میں شروعاتی پڑھائی کے بعد علی گڑھ مسلم یونیورسٹی سے انجینیر نگ کی ڈگری حاصل کی' علی گڑھ کی ایک مسجد میں 1,500 روپیہ ماہانہ پر امامت بھی کی پھر گواہاٹی میں چند پرانے کمپیوٹر حاصل کر کے بچوں کو پڑھانے لگے' لیکن ارادے بلند تھے' اللہ نے سازگار حالات پیدا کردئے' زمین کا انتظام ہوگیا' مالی استطاعت والے افراد نے امداد نہیں کی' پھر بھی ہمت مرداں مدد خدا نے اثر دکھایا' فی الوقت ان کے کیمپس میں ہزاروں طلبا وطالبات زیر تعلیم ہیں' یونیورسٹی کے علاوہ انھوں نے گیارہ عدد مزید مختلف النوع تعلیمی ادارے قائم کئے' یونیورسٹی کے نزدیک کے درجنوں گاؤں کے بچوں کی تعلیمی تربیت کا کام بھی اپنے ذمہ لے رکھا ہے۔ادھر چنئی میں بی ایس عبدالرحمن کریسینٹ یونیورسٹی قائم کرنے والے ان کے بیٹے عبدالقادر بوہاری نے بھی کم عمری میں ہی کارنامہ کر دکھایا' والد بزرگوار کے ذریعہ قائم کردہ سات اسکولوں اور پانچ کالجوں کو 2010 میں یو جی سی کے توسط سے یونیورسٹی کا درجہ حاصل ہوا۔قادر نے خود اپنے والد کے کریسینٹ اسکول میں ہی شروعاتی تعلیم پائی اور بعد میں امریکہ سے ایم بی اے کیا' اب وہ یونیورسٹی کے پروچانسلر ہیں' موجودہ طلباء میں سے تقریباً آدھے لڑکے لڑکیوں کے لئے ہوسٹلوں میں رہائشی انتظام بھی ہے۔ جودھپور کے بلڈنگ میٹیریل کے ٹھیکیدار محمد عتیق کے دل میں اللہ نے 'اقراء' کی برکت ڈال دی' انھوں نے ملت کی آرزؤں کی خوب تر بھرپائی کرتے ہوے وہاں مولانا آزاد یونیورسٹی قائم کردی' اس میں اوران کے ذریعہ قائم کردہ دیگر 31 تعلیمی اداروں میں ہزاروں بچے زیر تعلیم ہیں' کچھ طلبا

وطالبات کے لئے رہائشی ہوسٹل بھی ہیں۔

اس کے علاوہ یو پی کے جہانگیرآباد میں امریکہ میں مقیم منظورغوری کی تنظیم نے سائنس اینڈ ٹکنالوجی انسٹیٹیوٹ قائم کیا ہے جو زیادہ تر رہائشی ہے۔سید محمد افضل آئی پی ایس کو اللہ غریق رحمت کرے' انھوں نے اور ان بھائیوں سید محمد امین اور سید محمد اشرف نے علی گڑھ میں البرکات اسکول وکالج قائم کیا ہے' ریاض کے ندیم ترین نے کئی اسکول اور رہائشی ہوسٹل قائم کئے ہیں' کیرالہ کے امیر احمد کا خلیجی ممالک میں بڑا کاروبار ہے انھیں اللہ نے توفیق دی یو پی میں مدارس کے بچوں کے لئے انگریزی تعلیم مہیا کرنے کی' وہ اس راہ پر گامزن ہیں' جمعیت العلماء کے مولانا محمود مدنی نے دہلی کے قریب وسیع جدید عمارت بنا کر اس میں دینی ماحول میں بچوں کے لئے کیمبرج کورس کا انتظام کیا ہے اور وہ مدارس سے فارغ التحصیل طلبا کو انگریزی میں مہارت مہیا کرنے کے لئے مخصوص کورس کا انتظام بھی کرتے ہیں۔علی گڑھ کے سابق وائس چانسلر لفٹننٹ جنرل ضمیرالدین شاہ نے سلمان جعفری کی مدد سے کئی اسکول قائم کردئے ہیں اور جنرل شاہ نے ابھی حال میں آئیڈو کے نام سے نئی تنظیم قائم کی ہے جس کے ذریعہ ملک میں ملت کی تعلیمی ادارہ سازی کی کاوشوں میں وہ تال میل قائم کررہے ہیں' اس کار خیر میں جامعہ ہمدرد کے وائس چانسلر پروفیسر افشار عالم وصحافی شاہد صدیقی شامل ہیں۔اعظم گڑھ تو تعلیمی اداروں کا گہوارہ ہی بنتا جارہا ہے' دانشور حضرات وعلما کرام لگے ہوے ہیں ملت کے بچوں کو گنگا جمنی تعلیم مہیا کرنے میں۔حیدرآباد میں غیاث الدین بابوخاں کے لق و دق تعلیمی ادارے ملی نشو ونما میں خاموشی سے اعلیٰ رول ادا کررہے ہیں۔ممبئی میں قادر بھائی نے میونسپل کارپوریشن کے 22 اسکول اپنے ذمہ لے لئے' ان میں سرمایہ کاری کرکے انھیں بہتر بنایا اور اس طرح کثیر تعداد میں ملت کے بچوں کے لئے تعلیم کا انتظام چل رہا ہے' الانہ گروپ تعلیمی اداروں کی پذیرائی میں حصہ دار ہے۔کرناٹک کے شاہین گروپ 'اورنگ آباد کے کاوش گتوپ و پٹھنی کے وارم گروپ نے تعلیمی بیداری کے لئے کوشش کررکھی ہے۔دہلی میں گاڈس گریس گروپ نے کئی اسکول قائم کئے ہیں' یہ تحریکیں ہیں بیسویں صدی کے اواخر اور اس کے بعد کی۔اس کے علاوہ بیسویں صدی کے نصف اول میں بھی بڑی تعداد میں پورے ہندوستان میں مسلمانوں نے ہزاروں تعلیمی ادارے قائم کئے ہیں۔یقیناً ان سب لوگوں وخاندانوں کے لئے موجودہ واگلی دنیا میں خیر کے اسباب پیدا ہوتے رہیں گے انشااللہ اور سرسید کی روح کو بھی اس مہم کے چلتے رہنے کا ثواب پہنچتا رہے گا۔لیکن اس سب کے باوجود ہم تعلیمی میدان میں اہل وطن سے کافی پیچھے چل رہے ہیں۔وجہ بالکل صاف ہے' سماج کے بچوں کے لئے ضرورت کے مطابق تعلیمی ادارے قائم کرنے کا کام یا تو حکومت کا ہے یا سماج کا۔جسٹس سچر کمیٹی نے سرکاری اعداد شمار کی بنیاد پر ثابت کردیا کہ تمام دیہی وشہری علاقوں کی آبادی میں مسلمانوں کا تناسب جتنا زیادہ ہے وہاں سرکار کی طرف سے اتنے ہی کم تعلیمی ادارے ودیگر

بنیادی ڈھانچے قائم کئے جاتے ہیں حتیٰ کہ 100 فیصد مسلم علاقوں میں سرکاری ادارے ندارد ہیں۔ لہٰذا ضروری ہے کہ مسلمان حکومت کی کرسیوں پر بیٹھ کر بنیادی ڈھانچوں کی ساخت کے متعلق فیصلے خود کریں اور ساتھ ہی اپنے لئے تعلیمی ادارے اور بنیادی ڈھانچوں کی دیگر ادارہ سازی مسلمان اپنے لئے مکمل طور پر خود کریں۔

سول سروسز میں شمولیت کے لئے ملی کوششوں کی شرح میں گذشتہ 14-13 برس میں قدرے اضافہ ہوا ہے لیکن سرکاری بجٹ میں ہمارا حق نہ مارا جائے ابھی ہم وہاں تک نہیں پہنچے ہیں یہ مہم ہمیں صرف جاری ہی نہیں رکھنی ہوگی بلکہ اس میں تیزی بھی لانی ہوگی تب ہم اگلے 15-10 برس میں اس سمت کے کسی معقول پائدان تک پہنچ سکیں گے۔ یہ بھی یاد رکھنے کی ضرورت ہے کہ حال کے دو تین برس (2022-2019) میں مرکزی حکومت نے یو پی ایس سی کے ذریعہ منتخب ہونے والے افسروں کی تعداد میں بھاری کمی کر دی ہے اور اس کے برعکس اب حکومت کے اعلیٰ سرکاری عہدوں پر براہ راست تعیناتیاں کی جارہی ہیں اور اس کے لئے انڈسٹری میں پہلے سے کام کرنے والوں کو لیا جا رہا ہے۔ اس تبدیلی کے لئے حکومت دستور کے تحت خود مختار ہے۔ لیکن اس کی وجہ سے ہمیں بھی اپنی حکمت عملی اور منصوبہ بندی میں ردو بدل کرنا ہوگا۔ لہٰذا ہمیں صوبائی سطح کے پبلک سروس کمیشنوں، دیگر محکموں و عدالتوں کے ذریعہ منعقد کئے جانے والے امتحانوں کے لئے بھی اپنے بچوں کی تیاری بڑے پیمانہ پر کروانی ہے۔ ہمارے سرمایہ کاروں اور تاجروں کو آپسی تال میل میں ادارہ سازی کرنی ہوگی۔ ہماری تنظیموں کو زیادہ سے زیادہ سرکاری دفتروں میں اپنے کو رجسٹر کروالینا چاہئے، مثلاً رجسٹرار آف سوسائیٹیز اینڈ ٹرسٹس، محکمہ انکم ٹیکس، نیتی آیوگ کی ویب سائیٹ، وغیرہ۔ انفرادی طور پر ہمیں کوشش کر کے میونیسپل بورڈ یا کارپوریشن سے جاری کردہ اپنا برتھ سرٹیفیکیٹ (کوشش کر کے نکلوا لیں)، آدھار کارڈ، راشن کارڈ، الکشن کارڈ، پین (پرماننٹ اکاؤنٹ نمبر) کارڈ، ڈرائیونگ لائیسنس، ہائی اسکول سرٹیفیکیٹ کو ڈیجیٹائیز (Digitize) کر لینا چاہئے یعنی اپنے فون سے ان سب کا فوٹو کھینچ کر اسے اپنے کو ہی ای میل کر لیں، بلکہ اپنے بہن بھائی، بچوں یا والدین کو ای میل کر دیں۔ اس طرح خود کی پہچان کے یہ قیمتی دستاویز آپ یا آپ کے اہل خاندان بوقت ضرورت آسانی سے دستیاب کر سکتے ہیں۔ ہمیں اپنے رہائشی علاقوں کو اندرونی طور پر خود کفیل بنانا ہوگا، وہاں سی سی ٹی وی کے ذریعہ چوکسی بڑھانی ہوگی۔ سمجھ بوجھ پر مبنی اس انفرادی و سماجی بندوبست میں مساجد کمیٹیوں کو بھی متحرک ہونا چاہئے۔ ہر طرح اپنے کو اندرونی طور پر مضبوط کرنے کے لئے ہمیں اپنی متعدد کاوشوں میں اضافہ کرتے رہنا ہوگا۔ ہمارے بچوں کے لئے جتنے تعلیمی اداروں کی ضرورت ہے اس سے اب بھی بہت کم موجود ہیں، اس کی وجہ یہ ہے کہ جتنے لوگوں کو اپنی زمین جائداد، اپنی دولت، اپنے وسائل، اپنا وقت اور اپنا جذبہ محبت ملت کے لئے لگانا چاہئے (قرآن کریم 2.219) اتنے نہیں لگا رہے ہیں۔ ہم نے اپنے کو اللہ کے پیغام سے بے بہرہ کر رکھا

ہے۔ جمعہ کے خطبہ کے ذریعہ ہماری تربیت ہوتے رہنا چاہئے لیکن مادری زبان کے خطبات کے مواد کی منصوبہ بندی نہ ہونے کے برابر ہے اور خیر عربی خطبہ کا مفہوم تو اکا دکا جگہ ہی سمجھایا جاتا ہے۔امام وخطیب صاحبان ومساجد کی انتظامیہ سے منسلک خواتین وحضرات کی توجہ درکار ہے۔اس طور پر ہم سرسید کے خوابوں کو تعبیری جامہ پہنانے میں مزید کامیاب ہوسکیں گے‘ان شااللہ۔کیا خوب تاکید کر گئے علامہ اقبال:

تری فطرت امیں ہے ممکناتِ زندگانی کی
جہاں کے جوہرِ مضمر کا گویا امتحاں تو ہے

عبدالحق

معراجِ رسولؐ: فکرِ اقبال کا محرکِ تخلیق

بنی نوعِ بشر کی تاریخ کا سب سے مہتم بالشان واقعہ بعثتِ رسالت مآبؐ ہے۔ اور بعثتِ رسولؐ کا سب سے عظیم الشان، حیرت فروز معجزہ معراج کا سفر ہے۔ جو لامکاں کے مشاہدات سے معمور تکمیلِ دین کا منشور ہے۔ یہ حضور سرورِ کائناتؐ کا خاص امتیاز ہے جو کسی دوسرے نبی کا نوشتۂ تقدیر نہ بن سکا۔ اسی سے اسلام کے ارکان وعقائد کی اساس وادراک میں عالمِ غیب کے مشاہدات کی نور فشانی جلوہ گر ہوئی ہے۔ سفرِ معراج نزولِ نبوت کا حکیمانہ حادثہ اور سلسلۂ رسالت کے اختتام کا اعلانیہ ہے۔ دوسری طرف یہ ہمارے علم وعرفان کے لیے غیر معمولی موضوعِ سخن بھی ہے۔ شاید ہی کسی دوسرے موضوع پر اتنا ضخیم سرمایۂ کلام موجود ہو سیکڑوں معراج نامے منظوم کیے گئے یہ مقدس محفلوں میں جذبۂ شوق کے اظہار کا وسیلہ ہے۔ یہ ہماری فکری اور دینی ثقافت کا فروزاں عنوان بنا۔ اقبال کی دنیائے فکر میں معراجِ رسولؐ سرچشمۂ نور بن کر روشن ہوا۔ اسی کے پرتوِ جمال نے فکر اقبال کو تازگی اور طرب ناکی کی ارزانی بخشی ہے۔ سفرِ معراج کی سایہ نشینی شعرِ اقبال میں جابجا نظر آتی ہے۔ اسباب دعوتِ نظر کا مطالبہ کرتے ہیں۔ اس مطالبے میں فکر ونظر کے ساتھ عرفان وآگہی کی پاکیزگی بھی شامل ہے۔

اقبال کی فکر وتخلیق کے دو بہت ہی خاص اور اہم مصدر ہیں۔ کتاب اور صاحبِ کتاب ہی ان کے تلاطمِ افکار کا منبہ ومخرج ہیں۔ صحفِ سماوی کی آخری تنزیل قرآنِ کریم اور سلسلۂ ہدایت کے لیے آخری رسولؐ فکرِ اقبال میں روحِ رواں کی طرح سرگرم کار ہیں۔ اقبال نے صدقِ دل سے رموزِ بے خودی میں اعتراف کیا ہے ؎

آں کتابِ زندہ قرآنِ حکیم — حکمتِ او لازوال است وقدیم
نسخۂ اسرارِ تکوینِ حیات — بے ثبات از قوتش گیرد حیات
گردر اسرارِ قراں سفتہ ام — با مسلماناں اگر حق گفتہ ام [۱]

اسرارِ قراں کے موتیوں سے افکار کو مزین کرنے کا اظہار بہت ہی معنی خیز ہے۔ جسے مطالعۂ اقبال میں کسی

طرح نظر انداز نہیں کیا جا سکتا۔ اس اقرار میں بالِ جبریل کی غزل کا یہ شعر بھی پیشِ نظر رکھنا چاہیئے ۔

تھا ضبط بہت مشکل اس سیلِ معانی کا
کہہ ڈالے قلندر نے اسرارِ کتاب آخر [۲]

صاحبِ کتاب کے بارے میں اقبال نے ایک آخری بات کہہ دی ہے پس چہ باید کا یہ شعر مطالعۂ اقبال میں حقیقتِ ابدی کی طرح ایک بڑے انکشاف کی حیثیت رکھتا ہے

ایں ہمہ از لطفِ بے پایانِ تست
فکرِ ما پروردۂ احسانِ تست [۳]

یعنی یہ سب کچھ تیرے بے حساب لطف و کرم کی بدولت ہے تیرے احسان و عنایت نے میرے افکار کی پرورش کی ہے ۔ یہ دونوں اقرار اس قطعیت کے ساتھ کلامِ اقبال میں دوسری جگہ نظر نہیں آتے ۔ فکرِ اقبال کے سرچشموں کی بازیافت میں یہ نکات قندیل رہبانی کی حیثیت رکھتے ہیں۔ معراجِ رسولؐ کی تفصیل انہیں دو نکات پر منحصر ہے۔ اس گفتگو میں قرآن کریم کی آیات پر اکتفا کیا گیا ہے۔ فکرِ اقبال میں ان آیات کے حکیمانہ اظہار کی نشان دہی کے ساتھ ان کے مؤثرات پیشِ نگاہ ہیں۔ قران کریم کرۂ ارض پر نازل ہونے والی آخری مقدس اور دنیا میں سب سے زیادہ پڑھی جانے والی مبارک کتاب ہے۔ اس نے انسانی فکر اور معاشرتی نظام کو سب سے زیادہ متاثر کیا ہے۔ دانش و بینائی اور دین و ایمان کی تمام نسبتیں اسی سے منسوب ہیں۔ فکر و نظر کی راہیں بھی اسی سرچشمۂ فیض سے پھوٹتی ہیں۔ یہی کتاب مسلم ثقافت کا منہاج و مصدر بھی ہے۔

قرآن کریم کے حکیمانہ حوالوں سے اقبال کے فلسفہ و فکر کے نکات گہری بصیرتوں کے حامل ہوئے ہیں۔ یہ حوالے مختلف نوعیت اور صورتوں سے پُر نور ہیں۔ کہیں پوری آیت کریمہ پیش ہے۔ جیسے

ہر زماں پیشِ نظر ''لاتخلف المیعاد دار'' [۴]
ٹل نہیں سکتا ''وقد کنتم تستعجلون'' [۵]
اشہد ان لا الہ اشہدو ان لاالہ [۶]

کہیں آیت کریمہ کے ٹکڑے منظوم کیے گئے ہیں شعری ضرورتوں کی وجہ سے بھی اختصار سے کام لیا گیا ہے۔ صرف دو لفظوں سے استفادہ کیا گیا ہے، جیسے **لاتخف** ، **لاتحزنون** ، **لاتفسدو** ، **لاتقنطوا** ، **کن فیکون** ، **مازاغ** ، **قاب قوسین**۔ لیکن بیشتر مقامات پر صرف ایک لفظ سے پوری آیت کے اشارات منظوم کیے گئے ہیں۔

حاملِ خلق عظیم، صاحب صدق و یقیں

آیۂ تسخیر اندر شانِ کیست
ہر لحظہ ہے تازہ شانِ وجود

سورۂ رحمٰن کی آیت **کل یوم ھو فی شان** کی طرف اشارہ ہے۔ یہ صورت عام ہے۔ اکثر اشارات بدون حوالہ ہیں۔ آیات کے ترجمہ پر تکیہ کیا گیا ہے۔

کیا ہے تونے متاعِ غرور کا سودا

(ضربِ کلیم۔ لا الہ الا اللہ)

سورۂ آلِ عمران کی آیت 'وما الحیٰوۃ الدنیا الا متاع الغرور' سے ماخوذ ہے۔ لفظیات سے شاعری کا الہامی منظر نامہ منور ہوتا ہے۔ اکثر اشارات بدونِ حوالہ میں شعر میں کم وبیش ترجمہ کی صورت نظر آتی ہے۔

ہائے کیا اچھا کہا ظالم ہوں میں جاہل ہوں میں

آیت: **ظلوماً جھولًا** کی طرف اشارہ ہے

ہر شے مسافر ہر چیز راہی

کل من علیھا فان (سورۂ رحمٰن) کا ترجمہ محسوس ہوتا ہے۔

ہیں تیرے تصرف میں یہ بادل یہ گھٹائیں

انا سخرنا لکم مافی السمٰوات والارض کی طرف واضح اشارہ ہے جس سے کلام اقبال فروزاں ہے۔ یہاں قرآنی لفظیات کے حوالے نہیں دیئے گئے ہیں۔ معراجِ رسولؐ کے ذکر میں کلام اقبال میں کم وبیش ایسے ہی قرآنی اشارات موجود ہیں۔ جنہیں تکرار کے ساتھ منظوم کیا گیا ہے۔ معراج کی قدرے تفصیل سورۂ والنجم کے پہلے رکوع میں ملتی ہے۔ اس سورۃ کی طرف اشارے ملاحظہ ہوں۔ ضربِ کلیم میں نظم کے آخری شعر کا اشارہ بہت ہی فکر انگیز ہے۔

تو معنیٔ والنجم نہ سمجھا تو عجب کیا
ہے تیرا مدوجزر ابھی چاند کا محتاج

یہی اشارہ جاوید نامہ میں حلیم پاشا کے حوالے سے رقم کیا گیا ہے۔

قرأتِ آں پیر مردے سخت کوش
سورۂ والنجم داں دشتِ خموش

معراجِ رسولؐ کے تذکرے میں سورۂ والنجم کی آیت **مازاغ البصر وما طغیٰ** کی بہت زیادہ اہمیت

ہے۔اس آیت کریمہ کی تشریح وتعبیر میں مسلم ادبیات میں ایک بہت وقیع ذخیرۂ تحریر موجود ہے۔اس آیت کریمہ کی راز جوئی اور اسرار کشائی میں پورے واقعہ کی روح جلوہ نما ہے۔یہ حضور رسالتِ مآبؐ کے سفر کا نقطۂ عروج ہے یہی انتہائے کمال اور علوئے بشریت کی انتہا بھی ہے۔اقبال نے اسی آیت سے فکری استفادے کی قندیل روشن کی ہے۔ان کے تصورِ معراج کے ادراک کی تمام نور فشانی اسی نقطے پر مرتکز ہے۔

رموزِ بیخودی میں پہلی بار اس آیت سے اقبال نے اپنی اجتہادی فکر کو آراستہ کیا ہے

آں نگاہش سرِّ مازاغ البصر
سوئے قومِ خویش باز آید دگر

معراج کے اس پہلو کی باز آفرینی کو ان کے فکری اجتہاد سے منسوب کیا جانا چاہیے۔اس نکتہ کا حاصل ہے کہ معراج شہِ لولاکؐ کے لیے عالمِ غیب کے روحانی مشاہدات کا وسیلہ ہے جس سے وہ سرشار ہوئے اور روئے زمین پر واپس آکر بہت قلیل مدت میں ایک عظیم الشان اور مثالی معاشرہ کی تربیت کی۔اس فکری مقدمے کو اقبال نے تشکیل جدید کے چوتھے خطبہ میں دوسری بار بڑی صراحت نے بیان کیا ہے وہ اسے تکمیلِ دین اور انسان کامل کی سربلندی کا صلائے عام سمجھتے ہیں اقبال نے اسے نکتۂ معراج کا اسرارِ سفر اور رازِ نہاں تسلیم کیا ہے۔اس خیال کی تائید میں اقبال نے ایک جگہ لکھا ہے کہ رسولِ اکرمؐ لامکاں کے مشاہدات ومحصولات کو سینے میں سمیٹے ہوئے واپس آئے۔

چناں باز آمدن از لامکانش
درونِ سینہ او درکف جہانش

ذاتِ اقدسؐ کے سینے میں کائنات کے مشاہدات کا گراں مایہ سرمایہ محفوظ ہوا۔جاوید نامہ میں فلک زہرہ پر تیسری بار اسی آیت کا ذکر ملتا ہے۔

مازاغ البصر گیرد نصیب
برمقامِ عبدۂ گردد رقیب ۷

اقبال نے چوتھی بار 'ضربِ کلیم' میں دعائیہ کلمات کے طور پر اسے رقم کیا ہے

فروغِ مغزبیاں خیرہ کررہا ہے تجھے
تری نظر کا نگہباں ہو صاحبِ مازاغ ۸

رموز بیخودی میں پانچویں بار اس آیت کا اعادہ کیا گیا ہے:

اُمیّے پاک از ھوی گفتارِ او
شرح رمزِ ماغویٰ گفتار او

قرآن کریم کے سورۂ بنی اسرائیل میں معراج کا ذکر بہت مختصر ہے۔صرف ایک آیت سے اس کی عظمت کا اظہار ہوا ہے۔اقبال نے لفظ اسرا کئی جگہ استعمال کیا ہے اور اس کی گہری معنویت پر اشارے کیے ہیں۔ایک شعر میں قرآن کریم کی تلمیحات بیان کی گئی ہیں۔آدم کو علوم کا سکھانا اور محمدؐ کا سفرِ معراج دونوں حضورِ حق کی جلوہ گاہ کے رازِ نہاں ہیں

مدعائے علم الاسما ستے
سرِ سبحان الذی اسراستے [۹]

مثنوی مسافر میں بھی اسی آیت کریم کا اشارہ موجود ہے۔

آشکارا دیدنش اسرائے ماست
در ضمیرش مسجد اقصائے ماست [۱۰]

فکرِ اقبال میں سفرِ معراج کو بڑی معنویت حاصل ہے۔انہوں نے جاوید نامہ میں مردِ مسلماں کے لیے اسے سنتِ رسالت مآبؐ قرار دیا ہے۔

سنتِ او سرّ ے از اسرار او ست

اس سورہ کی دوسری آیت بھی فکر انگیز اور ہمارے دینی و روحانی مباحث میں سرِ عنوان شمار ہوتی ہے۔نبیؐ کا قربِ الٰہی اور اس کی پُر اسرار نوعیت پر تفسیر و احادیث میں بڑی دل کشا صورتیں موجود ہیں۔سیرتِ رسولؐ کے ذکر و فکر میں قاب قوسین سب سے لطیف اور سب سے زیادہ حیرت افروز منظر ہے۔اقبال نے مولائے کائنات کے اس مخصوص اور منفرد امتیاز کو جگہ جگہ منظوم کیا ہے۔ابتدائی اور متروک نظم 'فریادِ امت' کے یہ اشعار ملاحظہ ہوں۔

قاب قوسین بھی دعویٰ بھی عبودیت کا کبھی چلمن کو اٹھانا کبھی پنہاں ہونا
ماعرفنا نے چھپا رکھی ہے عظمت تیری قاب قوسین سے کھلتی ہے حقیقت تیری

اسی دور کی متروک نظم 'نالۂ یتیم' میں سورہ والنجم کی مذکورہ آیت کا دوسرا ٹکڑا بھی تلمیح میں شامل ہے۔

طور پر چشمِ کلیم اللہ کا تارا ہے تو
معنیٔ یٰسین ہے تو مفہوم او ادنیٰ ہے تو

'یٰسین' کی تلمیح کو بالِ جبریل کی غزل میں دہرایا گیا ہے۔

وہی فرقان ، وہی قراں ،وہی یٰسیں ، وہی طاہا

معراج کے تعلق سے سورہ والنجم کو بڑی فضیلت حاصل ہے۔اس کی آیاتِ کو اقبال نے کثرت سے اپنی فکری اساس کا عنصر بنایا ہے۔سفرِ معراج کے واقعہ نے اقبال کی فکر ونظر کو تحریک وتلاطم کی بے پایاں قوت بخشی ہے۔ان کی دنیائے فکر کا سب سے روشن باب اور شناخت کا امتیازی سبب سعیٔ پیہم کا انقلابی سبق ہے۔یہی ان کا حاصلِ فکر ہے جس کا مصدر قرآن کریم ہے جس میں غوطہ زن ہونے کی تاکیدی ہے۔اور اس کے بغیر زندگی محال ہے۔

نیست ممکن جز بقرآن زیستن

قرآن پر عمل پیرا ہونے کی حکیمانہ تاکید ان کے بنیادی فکری اسلوب کا نشانِ امتیاز ہے۔انہوں نے اسی کو زندگی کا میدان قرار دیا ہے۔جو انسان گرمیٔ قراں کی حرارت سے محروم ہے اس سے خیر کی امید رکھنا فضول ہے۔

سینہ ہا از گرمیٔ قراں تہی
از چنیں مرداں چرا امید ِ بہی

(جاوید نامہ)

اس سرچشمۂ فکر میں معراجِ رسولؐ کے واقعہ نے اقبال کے فلسفہ وفکر کو سرگرم عمل رہنے کا جو حوصلہ بخشا ہے۔اس کی نظیر نہیں ملتی۔اس سفر کے لذتِ پرواز نے اقبال کو پرجوش کیا ہے۔مسلم ادبیات میں غالباً اقبال کی پہلی مثال ہے جنہوں نے معراجِ رسولؐ سے متاثر ہوکر ایک عظیم الشان شعری تخلیق کو منظوم کیا۔جاوید نامہ میں سات آسمانوں کے سفر کی روداد قلم بند کی گئی ہے۔معلوم نہیں کیسے پروفیسر عبدالستار دلوی سے سات کی جگہ نو آسمانوں کے سیر کی غلطی ان کی کتاب اقبال اور بھرتہری میں داخل ہوگئی۔اس کتاب میں دوسرے گمراہ کن متن بھی شامل ہیں۔جن سے اقبال کا کوئی تعلق نہیں ہے۔قرآن سے لے کر ادب تک ہر جگہ سات آسمانوں کا ذکر ہوا ہے۔

رات دن گردش میں ہیں سات آسماں

یہ سفر فکر وعرفاں کے گہرے مسائل اور مباحث پر مشتمل ہے۔یہ شعری مجموعہ ۱۹۳۲ء میں پہلی بار شائع ہوا۔یہ اقبال کی تفکیر دینی کے امتیازات کو روشن کرنے کا سبب بنا۔اتنے فکری مباحث کسی اور تخلیق میں نظر نہیں آتے۔مطالعۂ اقبال میں یہ ناگزیر تخلیق ہے۔اسے صرف نظر کرکے اقبال کی تفہیم ممکن نہیں ہے۔فکر وشعر کے حیرت انگیز امتزاج کا یہ ایک حیرت خیز نمونہ ہے۔جس کی مثال نہ ماضی میں موجود ہے۔اور نہ حال میں حاصل ہوسکی۔اس بے مثال تخلیق کا محرک ومصدر معراجِ رسولؐ ہے۔یہ تخلیق معراج کے فیضان کا نتیجۂ فکر ہے تو دوسری طرف اس مبارک سفر کی اہمیت وغایت کو سمجھنے کے لیے ایک نیا فکری زاویہ نظر بھی ہے۔یہ ایک بڑے مفکر شاعر کا تخلیقی اعجاز بھی ہے۔شعری تخلیق کے علاوہ اقبال نے اپنی ڈائری StrayReflections میں اور خطبات میں بھی معراج کے حیرت انگیز حوالے دیے

ہیں۔

'تشکیل جدید' کے چوتھے اور پانچویں خطبے کی ابتدا کی عبارت بہت ہی فکر انگیز ہے۔ڈائری کا یہ جملہ بھی کم اہم نہیں ہے۔اقبال نے اپنے تصورِ خودی کو معراج رسولؐ سے نسبت دے کر ایک اجتہادی فکری نکتے کو پیش کر دیا ہے۔

"The Idea of Meraj in Islam is to face vision of reality without the slightest displacement of your own ego"

''اسلام میں معراج کا تصور اپنی خودی کا ایک لمحے کے لیے خیرگی کے بغیر حقیقتِ مطلق کا روبرو مشاہدہ ہے۔''

گویا معراج کا مشاہدہ فلسفۂ خودی کے وجود کی دلیل ہے۔اس لیے بھی اقبال کو اس سفر اور مسافر دونوں سے گہری فکری نسبت ہے۔جس کے طفیل تخلیق کا شاہ کار وجود میں آیا۔واقعۂ معراج کی معجز نمائی ہے کہ اقبال کے قلب ونظر میں اس کے مؤثرات تخلیق کے خونِ گرم میں تبدیل ہوئے مسلم ادبیات میں کسی ذی فکر تخلیق کار نے اس عظیم الشان سفر کے متعلقات پر ایسی گہری گفتگو نہیں کی۔حکمت ودانائی سے معمور جاوید نامہ کی تخلیق معراجِ رسولؐ کے تاثرات کی مظہر ہے۔جاوید نامہ عہد حاضر کے عظیم فن کار کا سفرِ معراج ہے۔جو بیداری اور بشری بدن کے حواس وادراک کے ساتھ ہے۔اقبال کے تمام شعری مجموعوں میں جاوید نامہ کو خاص امتیاز حاصل ہے کہ وہ ایمان ویقین کے ایک عظیم الشان واقعہ کے فیضان کا حاصل ہے۔اتنے متنوع اور گہرے افکار سے معمور ان کا کوئی دوسرا مجموعہ نہیں ہے۔ہونا بھی چاہیے تھا کیوں کہ اس کی نسبت کائنات کی سب سے برگزیدہ شخصیت سے ہے جو بہ ظاہر بشری مشتِ خاک میں نظر آتا ہے مگر حقیقت میں پیکرِ نور ہے۔اور جسے انوار کے جلوہ ہائے نوع بنوع نے گھیر رکھا ہے۔اس حقیقت کے بعد خواب وبیداری کی بحث اقبال کے نزدیک بے معنی ہے۔اقبال نے اپنے مردِ کامل کی شبیہ سازی کی ہے۔وہ خاکی ونوری نہاد اور بندۂ مولا صفات کا مجموعہ ہے۔اقبال نے معراجِ نبویؐ سے استدلال کیا ہے کہ انسان کامل کی اکمل ترین ذات حضور رسالتِ مآبؐ کی ہے۔کیوں کہ جلوۂ ربّانی کے روبرو ومشاہدات میں ایک لمحہ کے لیے بھی نگاہوں میں خیرگی نہ ہوسکی۔تابِ نظر ذاتِ رسولؐ کی تکمیلیت کی تمثیل ہے۔ذاتِ رسولؐ ہی انوارِ الٰہی کے تب وتاب کی متحمل ہوسکتی ہے۔ اقبال نے رموز بیخودی کے آخری حصہ 'عرض حال مصنف بحضور رحمت للعالمینؐ' میں اقرار کیا ہے۔

شش جہت روشن ز تابِ روئے تو

اس عنوان کا پہلا مصرع ہے

اے ظہور تو شبابِ زندگی

لفظ ظہور غور طلب ہے۔ کیوں کہ یہی لفظ اپنی تمام تر معنوی وسعتوں کے ساتھ بال جبریل کی مشہور تخلیق ''ذوق وشوق'' میں رسالتِ مآبؐ سے متعلق مشہور بند میں بھی مستعمل ہے۔

عالمِ آب وخاک میں تیرے ظہور سے فروغ
ذرۂ ریگ تو دیا تو نے طلوعِ آفتاب ۱۱

تجھے دیکھنے کے بعد سراپا نور بن جانا فیضانِ الٰہی کی نگاہِ ناز کا ادنیٰ کرشمہ ہے۔ پیامِ مشرق میں ہے:

سراپا نورم از نظارۂ تو

معراج کی عظمت وبرکت کے بارے میں اقبال نے جابجا اظہار کیا ہے۔ بانگِ درا کے حصۂ سوم میں ایک مختصر نظم ہے۔ معراج کی حقیقت اقبال پر منکشف ہوچکی ہے۔ اور یہ خیال فکر کو مہمیز کرتا ہے۔ اس خیال کی درخشانی تقریباً ہر جگہ نظر آتی ہے۔ اس شعر پر غور کرنے کی اشد ضرورت ہے سفرِ معراج کو رہ یک گام کہنا فکرِ اقبال کا بنیادی نکتہ ہے۔

کہہ رہی ہے یہ مسلمان سے معراج کی رات
رہِ یک گام ہے ہمت کے لیے عرشِ بریں ۱۲

اس کے بعد جاوید نامہ میں معراج کا کئی بار تذکرہ ہے۔ جو اقبال کی دینی فکر اور اجتہادی نظر کی وسعتوں اور انتہاؤں کی غمازی کرتے ہیں۔ معراج نے ہی جاوید نامہ جیسی عظیم الشان شعری تخلیق کو متحرک کیا ہے اس واقعہ اسرا کے رموز کو جدید فکری تناظر میں دیکھنے کی دعوتِ فکر ونظر بھی ہے۔ یہ نکتہ ملاحظہ ہو:

چیست معراج آرزوئے شاہدے
امتحانے روبروئے شاہدے ۱۳

دوسرا بیان بھی ملاحظہ ہو۔

از شعور است ایں کہ گوئی نزد ودور
چیست معراج انقلاب اندر شعور ۱۴

خالق تک رسائی اور اس کے روبرو فکر وعمل کے احتساب کی آزمایش ہی معراج کا اصل مفہوم ہے۔ جہاں سے بھی دیکھیے فکر وشعور میں اضطراب وانقلاب برپا کردینے کا نام ہی معراج ہے۔ گویا ذوقِ پرواز اور شعور میں

انقلاب آفرینی سفرِ معراج کی مرہونِ نظر ہے۔عزم وہمت ہوتو بالائے آسماں سے بھی پرے پرواز اور پہنچنے میں ایک جست کی ضرورت ہے۔پس چہ باید کرد میں تیسری بار اقبال نے مشہور حدیثِ نبویؐ کی اپنی فکر وآگہی سے ایک نئی تعبیر پیش کی ہے۔

دربدن داری اگر سوزِ حیات
ہست معراجِ مسلماں در صلوٰۃ

ہر نماز میں بندہ مالک کے روبرو ہوکر ربِّ جلیل کا مشاہدہ کرتا ہے۔اور ذات باری تعالیٰ بھی بندہ کو اپنی نگہِ کرم نواز سے دیکھتا ہے۔یہ دوسرا قولِ رسولؐ بھی اقبال کے پیش نظر ہے۔علامہ کا اصرار ہے کہ یہ اسی وقت ممکن ہے جب نمازی کے جسم وجاں میں جینے کی تڑپ اور تپش کا اضطراب ولولہ انگیزی برپا کیے ہو۔لفظ معراج کو چوتھی بار بالِ جبریل کی غزل میں استعمال کیا گیا اور اس حقیقت کا ادراک کرایا ہے کہ بحر وبر ہی نہیں آسمان کے سورج چاند اور چمکتے تارے بھی بنی نوع انسان کی زد میں ہیں۔

سبق ملا ہے یہ معراجِ مصطفیٰؐ سے مجھے
کہ عالمِ بشریت کی زد میں ہے گردوں ۱۵

اس سے قبل ۱۹۲۳ء میں ہی طلوع اسلام میں اقبال نے چرخِ نیلی نام سے بھی آگے مسلمان کی منزل بتائی ہے۔

پرے ہے چرخِ نیلی نام سے منزل مسلماں کی
ستارے جس کی گردِ راہ ہوں وہ کارواں تو ہے ۱۶

یہ تصورات تخیلی یا مثالی نہیں ہیں۔اقبال کی دلیل ہے کہ مالک کون ومکاں کے محکم ارشادات ہیں جس میں تسخیر کائنات کی بشارت ہی نہیں۔عہد وپیمان کا اقرار نامہ بھی موجود ہے۔آیۂ تسخیر کو اقبال نے بار بار یاد دلایا ہے۔

آیۂ تسخیر اندر شانِ کیست ایں سپہرِ نیلگوں حیران کیست ۱۷

'ضربِ کلیم' میں پانچویں بار اقبال نے معراج عنوان کی مختصر نظم میں معراجِ رسولؐ کی روح کو اپنے فکری نظام وپیغام کا حاصل قرار دیا ہے۔ولولۂ شوق اگر پیدا ہوجائے تو بندۂ خاکی اپنی لذتِ پرواز سے چاند اور سورج کو بھی اپنی گرفت میں لاسکتا ہے۔معراجِ نبوی مخصوص امتیاز اور سیرت سرورِ عالمؐ کا سب سے عظیم معجزہ ہے۔یہ سرِّ سرا یعنی رازِ دوعالم کی تسخیر کا نسخۂ نبوت ہے۔نظم کا پیغام اور لفظیات کے معنوی متعلقات توجہ طلب ہیں۔یہی پیغامِ سفر پوری شاعری اور فکر میں رودِرواں بن کر جاری ہے۔جس کے مختلف نام اور متنوع اشارات ہیں۔

دے ولولۂ شوق جسے لذتِ پرواز
کرسکتا ہے وہ ذرہ مہ ومہر کو تاراج [۱۸]

ایک جگہ کہا ہے کہ زندگی کا حاصل لذتِ پرواز ہے۔

زندگی جز لذتِ پرواز نیست

اس شعر میں نکتۂ معراج کی روح جلوہ فشاں ہے۔ ولولۂ شوق اور لذتِ پرواز سے اقبال کو خاص لگاؤ ہے۔ کلام میں کئی بار تکرار کے ساتھ ان لفظوں کا استعمال ہوا ہے۔ اردو و فارسی شاعری میں ولولہ اور پرواز کا کثرتِ استعمال فکر اقبال کے نہاں خانۂ راز میں بڑی معنویت کا حامل ہے۔ جیسے

اک ولولۂ شوق دیا میں نے دلوں کو [۱۹]
دلوں میں ولولۂ انقلاب ہے پیدا [۲۰]
دلوں میں ولولے آفاق گیری کے نہیں اٹھتے [۲۱]

لفظ پرواز فکر اقبال کا بہت محبوب اور معنی خیز استعارہ ہے جو کثرت سے کلام میں ملتا ہے۔ یہی پرواز مسلسل جدوجہد کے آداب سکھاتا ہے اور سعیٔ پیہم کو جنوں خیز کرتا ہے۔

زندہ تر گردد ز پرواز ِ مدام
پرواز ہے دونوں کی اسی ایک فضا میں
ہوئی نہ زاغ میں پیدا بلند پروازی
شاہیں کبھی پرواز سے تھک کر نہیں گرتا
جس رزق سے آتی ہے پرواز میں کوتاہی
فقط ذوقِ پرواز ہے زندگی
جہاں میں لذت پرواز حق نہیں اس کا
وجود جس کا نہیں جذب خاک سے آزاد

(بال جبریل)

درجنوں اشعار اسی استعارے کی بدولت زندگی کی تابانی کے مضمرات سے روشن ہیں اقبال نے بڑی قطعیت کے ساتھ اس نکتے کو پیش کیا ہے کہ اگر جذب وشوق ہو تو مٹی کا یہ بدن پرواز میں حائل نہیں ہوسکتا۔ یہ خاکی جسم صرف مٹی کا ڈھیر نہیں ہے۔ معراج نبیؐ اس پر واضح دلیل اور مشعل راہ ہے۔

ایں بدن ماجانِ ما انبار نیست
مشتِ خاکے مانعِ پرواز نیست۲۲

اسی ضمن میں معراج سے متعلق یہ قول بھی ملاحظہ ہو۔

خاک را پرواز بے طیارداد

فرزندآدم بہ ظاہر مشت خاک نظر آتا ہے۔مگر اس کی سرشت میں افلاکی صفات بھی ہیں۔اقبال کا یہ شعر پیشِ نظر رکھیے۔

کی حق سے فرشتوں نے اقبال کی غمازی
خاکی ہے مگر اس کے انداز ہیں افلاکی

معراج کے تعلق سے سیر افلاک کے منظر نامے کو پیشِ نگاہ رکھیے اور کلام کو دیکھیے تو اس سے نسبت رکھنے والے ذخیرۂ الفاظ فکرِ اقبال کے موثرات کی غمازی کرتے ہیں۔ان کے فکر کی دنیا میں اس واقعہ نے ایک انقلاب برپا کیا ہے۔فلک، عالمِ افلاک سیر افلاک، فلک الافلاک، مکاں لامکاں، کہکشاں، آسماں، انجم، مہ ومہر، نیلگوں افلاک، بندۂ آفاق، صاحبِ آفاق، ستاروں سے آگے، پرے ہے چرخ نیلی فام گم اس میں ہے آفاق۔اقبال کی نگاہ میں آب وخاک کچھ حقیقت نہیں رکھتے انسان کی ماہیت اس سے آزاد اور مادے سے ماورا ہے۔اس میں پوشیدہ روح کی ہی جلوہ نمائی ہے جو لافانی ہے اور لازماں بھی۔

آدمے از آب وگل بالاترے

یہی روح تڑپنے پھڑکنے کی توفیق بخشتی ہے اور پرواز مدام کے اضطراب سے جسم وجاں کو گرم جوش رکھتی ہے ۔بود ونمود کی کشاکش پیہم سے جوہرِ زندگی آشکار ہوتا رہتا ہے۔اقبال کے پیغام پر توجہ درکار ہے۔یہ پیغام اسی انقلاب کی دعوتِ عام ہے جسے اقبال نے معراج کو شعوری انقلاب سے تعبیر کیا ہے

چیست معراج انقلاب اندر شعور

اس شعور کی بیداری سے ہی بیداریٔ کائنات کا عرفان ہوتا ہے یہی بیداری لامکاں وبرمکاں پر کمندیں ڈالتا ہے۔اور اپنے شعلے سے جہانِ مکافات کو زیروزبر بھی کرتا ہے۔گلشنِ راز جدید کا یہ فکر انگیز شعر ہماری حیرت فروزی میں اضافہ کرتا ہے۔

چو آتشِ خویش را اندر جہاں زن
شبیخوں برمکاں ولامکاں زن ۲۳

اپنے وجود کی آگ سے لامکاں پر شب خوں مارنے یعنی رسائی اور بازیابی کا حوصلہ معراجِ رسولؐ کے طفیل ہے۔ اقبال اسی ولولے کو مردِ مسلماں کے قلب ونظر میں جاگزیں کرنا چاہتے ہیں۔ زمان ومکاں کے قید وبند میں اسیر ہوجانے کو اقبال ناپسند کرتے ہیں۔ کیوں کہ معراجِ رسولؐ نے ان حدود کو عبور کر کے ایک مثال قائم کی ہے۔ رسولِ مقبولؐ کے سفر میں زمانہ ٹھہر گیا۔ مکاں کی تمام وسعتیں منجمد ہوگئیں۔ اور آپ نورِ ربّی کے روبرو ہوئے۔ بنی نوع بشر کے لیے بھی یہی منہاج ہے اور منشائے سیرتِ پیغمبر خاتمؐ بھی۔

تو اے اسیرِ مکاں لامکاں سے دور نہیں
وہ جلوہ گاہ ترے خاکداں سے دور نہیں
فضا تری مہ وپرویں سے ہے ذرا آگے
قدم اٹھا یہ مقام آسماں سے دور نہیں ۲۴

معراجِ رسولؐ عروجِ آدم خاکی کی سب سے روشن دلیل ہے۔ اور انسان کے منصب ومقام کی راہِ سلسبیل بھی۔ کہکشاں، تارے، نیلگوں افلاک عروج آدم خاکی کے منتظر اور استقبال کے لیے فرشِ راہ ہیں۔ اقبال نے بالِ جبریل کی غزل میں اس حرفِ راز کو نفس جبرئیل کے حوالے سے بتایا ہے کہ جذبِ مسلمانی سر فلک الافلاک کی پنہائیوں کو اپنے وجود کے اندر مرتکز کر لیتا ہے۔

اک شرعِ مسلمانی اک جذبِ مسلمانی
ہے جذبِ مسلمانی سرِ فلک الافلاک ۲۵

معراجِ رسولؐ کے سلسلے میں یہی سب سے اہم اور فکر انگیز نکتہ ہے جس پر علما واکابرین نے عقل وخرد کی گتھیاں سلجھانے میں دانش وبینش کا بڑا سرمایۂ ادب تخلیق کیا ہے۔ اقبال کا اجتہادی نقطۂ نظر یہ ہے کہ ذات گرامیؐ کے وجود میں کائنات کی تمام وسعتیں اور پنہائیاں جذب ہوگئیں۔ نہ زماں رہا نہ مکاں۔ صرف بندہ رہا اور بندہ نواز۔ وقت ٹھہر گیا مکاں سمٹ گیا۔ بندۂ مومن کی یہی شان وشناخت ہے اور یہی اس کے وجود کا ہدف بھی ہے۔ اسی کو مذکورہ اشعار میں پیش کیا ہے مزید صراحت کے لیے ان کے مشہور شعر پر بار دگر غور کرنے کی ضرورت ہے۔ اقبال انسان کو صاحبِ آفاق بننے کی آرزو رکھتے ہیں۔

اس مردِ خدا سے کوئی نسبت نہیں تجھ کو
تو بندہ آفاق ہے وہ صاحبِ آفاق ۲۶

مومن کے قلب وجگر میں خود آفاق گم ہوتا ہے اور غیر مومن کی پہچان ہے کہ وہ زمین وآسماں کے درمیان

اپنے وجود سے محروم نظر آتا ہے۔ یہ شعر محاورہ ہی نہیں انسانوں کی پرکھ کا ابدی میزان ہے

کافر کی یہ پہچان کہ آفاق میں گم ہے
مومن کی یہ پہچان کہ گم اس میں ہے آفاق ۲۷

ان آسان لفظوں میں فلسفہ وفکر کی گہرائی دل ونظر کو مسحور کرتی ہے اور آدم خاکی کے مقام کو بار بار سمجھنے کے لیے ضرب لگاتی ہے۔ اقبال بے سوادی اور کم نگاہی پر ماتم بھی کرتے ہیں وہ انسان کو بخشی گئی تسخیر کائنات کی بشارت سناتے ہیں کیوں کہ اس میں زمین وآسمان کو بدل دینے کی قوت ایک حقیقت ہے۔ جس فطرت نے بڑی فیاضی سے سپرد کی ہے۔ ارض وسما کا اس کے وجود میں گم ہونے یا سمٹ جانے کا فیصلہ بھی فضلِ ربّی ہے۔ اقبال ان کمالات سے متصف ہونے کا اقرار کرتے ہیں۔ انسان کائنات کے سربستہ راز کو افشا کرنے کے لیے پیدا ہوا ہے۔ زمان ومکاں کی تسخیر بھی اس کا نوشتۂ تقدیر ہے۔ جاوید نامہ کے آغاز میں تمہیدِ زمینی کے ذیل میں لکھا ہے

باش تا عریاں شود ایں کائنات　　شوید از دامانِ خود گردِ جہات
برمکاں وبرزماں اسوار شو　　فارغ از پیچاک ایں زنار شو ۲۸

اسی سلسلے میں یہ شعر معنیٰ خیز ہے کہ کائنات کو بے حجاب کیا جائے کہ کوئی پردہ حائل نہ ہوتا کہ انکشافات کے لیے کوئی رکاوٹ مانع نہ رہے۔ اسی طرح اقبال نے اپنے وجود کو بھی بے پردہ دیکھنے کی تلقین کی ہے۔ اس بے حجابی کا سلسلہ بھی ذاتِ حق اور ذات رسالت مآبؐ کے درمیان مازاغ البصر کا اشارہ ہے۔ اپنے وجود کی آگہی کے لیے بھی ضروری ہے۔

برمقامِ خود رسیدن زندگی است
ذات را بے پردہ دیدن زندگی است ۲۹

اسی کو معراجِ رسولؐ کے تعلق سے انقلاب اندر شعور کہا گیا ہے۔ وجود کے احساس کا انقلابی شعور ہی مکاں ولامکاں سے بھی پرے پرواز کے لیے مائل اور مجبور کرتا ہے۔ اپنی ذات وصفات کا عرفان ہی اقبال کے فکر وفلسفہ کی روح ہے۔ جسے خودی سے تعبیر کیا ہے۔ اس کی سربلندی عین ذات کے مشاہدات سے سرشار کرتی ہے۔ معراجِ رسولؐ سے ماخوذ اقبال کا یہ حکیمانہ اشارہ فکر ونظر کی راہوں کو روشن کرتا ہے۔ اس سے قبل معراج کو سنّتِ رسولؐ کہہ کر اقبال نے ایک بلیغ نکتے کا انکشاف کیا ہے۔ ربِّ عالم نے اطاعتِ رسولؐ کو صاحبِ ایماں کے لیے لازمی قرار دیا ہے اطاعت واتباع میں روح وبدن کی قید نہیں روح کی پاکیزگی اور قلب ونظر کا اضطراب بھی شامل ہے۔ ذات گرامیؐ کی ہر ہر ادا کی تقلید اور دل وجاں سے تسلیم کرنا ہی دونوں جہاں کی فلاح ونصرت کی دلیل ہے۔ اقبال کا خیال افروز اور

عارفانہ اظہار بڑی بلیغ معنویت کا حامل ہے

عاشقی محکم شود از تقلیدِ یار
تا کمندِ تو شود یزداں شکار ۳۰

حضورِ حق کے ساتھ اپنے وجود یعنی خودی کا عرفان، لذتِ پرواز کا ولولۂ شوق، سعیِ پیہم، تسخیرِ کائنات کا سوزِ دروں، زمان ومکاں کے قید وبند سے آزادی، جلوۂ صفات کے مشاہدات سے مثالی معاشرے کی تشکیل وتربیت فکرِ اقبال کا ہفت پہلو آئینۂ جہاں ساز ہے۔ اوران سب کا قبلہ نما رسولِ عربیؐ کا سفرِ معراج ہے۔

حوالے

۱۔	رموزِ بیخودی	۱۶۔	بانگ درا
۲۔	بالِ جبریل	۱۷۔	جاوید نامہ
۳۔	پس چہ باید کرد	۱۸۔	ضربِ کلیم
۴۔	بانگِ درا	۱۹۔	بالِ جبریل
۵۔	بانگِ درا	۲۰۔	ضربِ کلیم
۶۔	بالِ جبریل	۲۱۔	بالِ جبریل
۷۔	جاوید نامہ	۲۲۔	جاوید نامہ
۸۔	ضربِ کلیم	۲۳۔	جاوید نامہ
۹۔	اسرارِ خودی	۲۴۔	بالِ جبریل
۱۰۔	مثنوی مسافر	۲۵۔	بالِ جبریل
۱۱۔	بالِ جبریل	۲۶۔	ضربِ کلیم
۱۲۔	بانگِ درا	۲۷۔	ضربِ کلیم
۱۳۔	جاوید نامہ	۲۸۔	جاوید نامہ
۱۴۔	جاوید نامہ	۲۹۔	جاوید نامہ
۱۵۔	بالِ جبریل	۳۰۔	اسرارِ خودی

انگریزی مقالہ از ڈیوڈ میتھیوز
اردو ترجمہ از: عبدالرحیم قدوائی

کلام اقبال کی آفاقیت

بیسویں صدی میں جتنا اعزاز اور اکرام اقبال کو حاصل ہوا وہ کسی اور اردو ادیب کو نصیب نہیں ہوا۔ اقبال کی ستائش کے ڈانڈے ان کی تعظیم اور توقیر سے جا ملے ہیں۔ پاکستان میں ان کو اس سلطنت خداداد کا نظریاتی بانی تعلیم کہا جاتا ہے اور ان کا نام نامی محمد علی جناح کے پہلو بہ پہلو انتہائی تکریم اور توصیف کے ساتھ لیا جاتا ہے۔ ہندوستان اور دنیا کے ہر اس گوشے میں جہاں اردو کا چلن ہے 'صرف مسلمانوں ہی میں نہیں' ہر مذہب اور فکر کے پیروؤں کے دل و دماغ میں اقبال کو ایک خصوصی' ارفع مقام حاصل ہے۔

البتہ یہ امر واقعہ ہے کہ محدود اردو دنیا کے باہر وہ قدرے عنیر معروف۔ ہیں لیکن یہ حقیقت بھی ہے کہ برصغیر ہندو پاک کی جدید تاریخ ان کے کارناموں کے تذکرے کے بغیر نامکمل رہتی ہے۔ ہر اردو داں کے حافظے میں اقبال کے چند اشعار ضرور محفوظ رہتے ہیں اور اوالین اشاعت سے اب تک ان کے کلام کا حسن اور رعنائی برقرار ہے۔ ان کا شمار اردو کے ان چند خوش نصیب اہل قلم میں ہے جن کی تصانیف نفیس انداز میں اور انتہائی احتیاط کے ساتھ شائع ہوتی رہتی ہیں اور ان کی حیات اور خدمات فکر و فن' فلسفے اور دیگر پہلوؤں پر اب تک ہزاروں کتب اور مقالے زیور طبع سے آراستہ ہو چکے ہیں۔ یہ امر شک وشبہ سے بالاتر ہے کہ ان کا نام اور کلام ایک طویل عرصے تک یاد رکھا جائے گا اور ان کے کارنامے ہمیشہ اردو ادب کے ایک درخشاں باب کے طور پر زندہ اور تابندہ رہیں گے۔

Dr.David Matthews (۱۹۴۲ء - ۲۰۲۱ء) اردو زبان وادب کے برطانوی فاضل لندن یونورسٹی کے اسکول آف اورینٹل اینڈ افریقن اسٹڈیز سے تیس سال تک اردو تدریس اور تحقیق سے وابستہ رہے۔ اردو زبان کی تدریس۔ میر انیس اور اقبال پر ان کی وقیع تصانیف ہیں زنظر مقالہ بعنوان۔ the Universal Appeal of Iqbal Verse پاکستا کے محلّے The iqbal Review جلد ۴۵ شمارہ ۴۰ ۲۰۰۴ء ص ض ۵۱۔۶۴ میں شائع ہوا تھا۔

پروفیسر۔ علی گڑھ مسلم یونیورسٹی۔ علی گڑھ۔ مغربی مشاہیر کے اقبال کے فکر و فن پر مقالات کے اردو ترجمے جلوۂ دانش فرنگ (اقبال اکیڈمی ہند) کے مصنف۔ Email: sluaim_05@yahoo.co.in.

اردو داں طبقے کی روزمرہ زندگی میں آج بھی کلاسیکی شاعری اہم ہے اور مشاعروں میں شائقین شاعری اس پر داد و تحسین کے ڈونگرے برساتے ہیں۔ یہ کلاسیکی شاعری پاکستان سے باہر نئی اردو بستیوں میں بھی بہت مقبول ہے۔ اقبال نے قدرۃً اسی کلاسیکی اسلوب کو اپنے خیالات کی ترجمانی کے لیئے اختیار کیا۔ اگر انھوں نے اپنے افکار کی پیش کش کے لئے خشک بے مزہ نثر کا پیرایہ اختیار کیا ہوتا تو ان کے قارئین کی تعداد یقیناً بہت کم اور معمولی ہوتی۔

اقبال کے فلسفیانہ نظام میں نقادوں نے بلاشبہ ابہام اور بعض تضادات کی نشاندہی کی ہے لیکن اس کاوش کے دوران وہ اس حقیقت کو نظر انداز کر بیٹھتے ہیں کہ اقبال اصلاً اور بنیادی طور پر ایک شاعر تھے اور ان کے مخاطب اپنے قارئین کے دل و دماغ تھے۔ اقبال کے ہاں مقصود عشق وجدانِ سے عبارت ہے اور عقل سے برتر ہے۔ اور اسی باعث ان کے کلام کو غیر معمولی مقبولیت حاصل ہوئی اس کی مثال مندرجہ ذیل سے واضح ہے۔

مجمو عۂ اضداد ہے ، اقبالؔ نہیں ہے
دل دفترِ حکمت ہے ، طبیت خقّانی
رِند ی سے بھی آ گاہ، شریعت سے بھی واقف
پُوچھو جو تصوف کی تو منصور کا ثانی

اقبال کو شعر گوئی کا ایسا ملکہ ودیعت ہوا تھا کہ وہ اپنے لطیف اور پیچیدہ دونوں خیالات کو عوام الناس تک عام فہم محاورۂ بیان میں پیش کرنے پر قادر تھے۔ یہی ان کی غیر معمولی مقبولیت کا سبب ہے اور اسی میں ان کے کلام کے قائم اور دائم رہنے کا راز پوشیدہ ہے۔

پنجاب کے ایک چھوٹے سے شہر سیال کوٹ میں ۱۸۷۷ء میں اقبال پیدا ہوئے ان کے والد ایک معمولی درزی تھے البتہ انھوں نے اپنے اہل خانہ کی تربیت راسخ العقیدہ اسلامی ماحول میں کرنے کا اہتمام کیا اور کم سنی ہی سے اقبال کو قرآن کے مطالعے اور پختہ سنّی عقائد پر قائم رہنے کی تلقین کی۔ ان عقائد سے اقبال نے اپنی تمام عمر انحراف نہیں کیا۔ اپنے معاصرین کی مانند وہ فارسی کے کلاسیکی ادب کے بحر ذخار کے شناور تھے اور اس کا اثر ان کی تصانیف پر ثبت ہے۔

ان کی پیدائش سے بیس سال قبل ۱۸۵۷ء کے غدر (جسے اب بالعموم پہلی جنگ آزادی سے تعبیر کیا جاتا ہے) کے واقعات سے ہندوستان اور بالخصوص مسلمان بری طرح متاثر تھے کہ اسی دور میں زوال پزیر مغلیہ سلطنت کا سقوط ہوا اور ہندوستان پر برطانوی تسلط قائم ہو گیا۔ بہادر شاہ ظفر کی تخت سے معزولی کے نتیجے میں ہندوستانی مسلمانوں میں اپنی قوت اور اقتدار کے خاتمے کا احساس ہوا اور متعدد اصلاحی تحریکیں اور ردعمل منظر عام پر آئے۔ اس

دور کے ایک عظیم مصلح سرسید احمد خاں ہوئے ہیں۔ سرسید کی بصیرت پر یہ حقیقت فوراً القا ہوگئی کہ نئے نظام میں جدید تعلیم کے بغیر مسلمان شدید خسارے میں رہیں گے اور ترقی کا واحد راستہ جدید تعلیم پر عبور میں مضمر ہے۔ ان کا مہتم بالشان کارنامہ مسلم یونیورسٹی علی گڑھ کا قیام ہے۔ یہ دانش گاہ ثابت ہوئی۔ سرسید کے اردگرد ان کے ہم خیال متعدد رفقاء جمع ہوگئے ان میں ایک نمایاں شخصیت معروف صاحب قلم اور شاعر الطاف حسین حالی کی ہے۔ ان کی طویل نظم مدوجزر اسلام معروف بہ مسدس ۱۸۷۷ء میں شائع ہوئی۔ ہر چند کہ اس نظم کی ہیئت اور اسلوب روایتی ہے لیکن اس میں بالکل واضح انداز میں مسلمانوں کی عظمت پارینہ کا نقشہ کھینچا گیا ہے۔ قرون اولیٰ میں ان کے جذبۂ دینی کی حرارت وحمیت کو بیان کیا گیا ہے' ان کی فتوحات جمیلہ کا ذکر کیا گیا ہے اور علوم نقلیہ وعقلیہ کی ان کی سرپرستی اور فروغ کا اظہار کیا گیا ہے مگر اپنے عہد میں مصنف کو ہندوستانی مسلمانوں کا چہار سو نکبت اور ادبار نظر آتا ہے۔ یہ تذکرہ اتنا موثر اور رقت انگیز ہے کہ اس میں مسدس کے بند پڑھتے ہوئے آج بھی بہت سے قارئین اشک بار ہوجاتے ہیں مثلاً یہ اشعار دیکھیں:

وہ ملت کہ گردوں پر جس کا قدم تھا
ہر ایک کھونٹ میں جس کا برپا علم تھا
وہ فرقہ جو آفاق میں محترم تھا
وہ امت لقب جس کا خیرالامم تھا
نشاں اس کا باقی ہے صرف اس قدر یاں
کہ گنتے ہیں اپنے کو ہم بھی مسلماں

اپنی نوعمری اور اثر پذیری کے دور میں اقبال کا سابقہ ایسی ہی شاعری سے ہوا۔ البتہ اسی دور میں وہ عظیم کامل الفن کلاسیکی فارسی شعراء مثلاً سعدی، حافظ اور خاص طور پر رومی سے متاثر ہوئے۔ اقبال کا معتد بہ کلام فارسی میں ہے۔ ان کی ذات میں فارسی زبان ہی انکی فکر اور مزاج سے ہم آہنگ تھی اور ان کا یہ خیال بھی تھا کہ فارسی کے توسط سے ان کو قارئین کا وسیع تر حلقہ میسر ہوگا۔ اس بات میں ان کی رائے کی صحت کے بارے میں کلام ہے۔ کیونکہ ایرانی نژاد قارئین کو ان کی فارسی پر تصنع اور متروک محسوس ہوئی وہ ان اہل زبان کے ذوق سے مناسبت نہ رکھتی تھی۔ ایران میں صرف حالیہ سالوں میں اقبال کو دریافت کیا گیا ہے اور ان کا مطالعہ کیا جارہا ہے۔ غرض یہ کہ اقبال کے معاصر فارسی قارئین کے لئے ان کا محاورہ بیان نامانوس تھا اور آج جبکہ ہند پاک میں فارسی قارئین برائے نام رہ گئے ہیں ان کے فارسی کلام تک رسائی بہت محدود ہوگئی ہے۔ اقبال کو اصل کامیابی ان کے اردو کلام کے باعث حاصل ہوئی مثلاً ان کے

اولین مجموعۂ کلام بانگ درا کی افتتاحی نظم ''ہمالہ'' قارئین کے ذوق وشوق کے عین مناسب ثابت ہوئی:

اے ہمالہ! اے فصیل کشور ہندوستاں
چومتا ہے تیری پیشانی کو جھک کر آسماں

یہ نظم اقبال کے دورِ طالب علمی کی ہے البتہ اس کے بعض عناصر ایسے ہیں جو ان کے آئندہ فارسی اور اردو کلام کی شناخت ثابت ہوئے۔ پہلے ہی مصرعے میں خطابت کا جوہر نمایاں ہے۔ مزید برآں، اس بند میں تخلیق کے تئیں آسمان کا تحیر 'سدا بہار جوانی کا وفور' کوہ طور پر موسیٰ کا تجلی الٰہی سے سرفراز ہونا ایسے محاکات اور موضوعات ہیں جو ان کے کلام میں تواتر سے موجود ہیں۔

ان کے ابتدائی کلام میں حب الوطنی کے جذبات، ہندوستان کی قدیم تاریخ اور اس کی سطوت اور عظمت سے سروکار نمایاں ہے۔ یہ کلام ۱۹۰۵ء میں ان کے سفرِ انگلستان سے قبل کا ہے ان کی مندرجہ ذیل نظم سے گاندھی ایسا متاثر ہوئے کہ انھوں نے اسے بطور قومی ترانہ اختیار کرنے کی تجویز پیش کی۔

سارے جہاں سے اچھا ہندوستاں ہمارا
ہم بلبلیں ہیں اس کی یہ گلستاں ہمارا

سادہ ترین زبان میں ایسی طفلانہ قوم پرستی کی ترجمانی اور بلبل در چمن کی پامال ترکیب وغیرہ دور حاضر کے ادبی مذاق کے مطابق یقیناً نہیں ہیں لیکن اپنے دور تصنیف میں ان کی کشش اور تاثیر شدید تھی۔ ہندو مسلم اتحاد کے بارے میں اقبال کے موقف کو پیش کرتے ہوئے ہندوستانی شارحین اقبال کی مذکورہ بالا نظم اور اس کی مثل دیگر نظموں کو بہ طور سند پیش کرتے ہیں۔ اقبال کا موقف یقیناً یہی تھا۔ آج بھی بہت سے ہندوستانی جو اردو کا ایک حرف بھی نہیں پڑھ سکتے اقبال کی اس نظم کو دل وجان سے یاد رکھتے ہیں۔

کالج میں تعلیم کے دوران اقبال نے انگریزی پر عبور حاصل کیا۔ پھر وہ بغرض اعلیٰ تعلیم یوروپ گئے اور جرمن اور انگلستان میں تین سال مقیم رہے وہاں انھوں نے تعلیم بھی پائی اور تعقل اور تفکر کی وادیاں بھی طے کیں۔ ۱۹۰۸ء میں ہندوستان مراجعت کے بعد ان کی شاعری کے موضوعات، طرز ادا اور محاورۂ بیان میں نمایاں تبدیلی رونما ہوئی۔

۱۹۱۱ء میں انجمن حمایت اسلام کے ایک جلسے میں اقبال نے اپنی نظم شکوہ پیش کی۔ اس کا شمار ان کی ممتاز ترین نظموں میں ہوتا ہے۔ نظم کے شروع میں فارسی تراکیب قارئین کے دل ودماغ کو بالکل مسحور کر دیتی ہیں اس کے معاً بعد خود خدا سے شکوہ کی ابتدا ہوتی ہے۔

کیوں زیاں کار بنوں سود فراموش رہوں
فکر فردا نہ کروں محو غم دوش رہوں

شکوہ کا انداز مسدس حالی سے مشابہ ہے۔اس میں بھی مسلمانوں کی عظمت رفتہ کا ذکر ہے اور دورِ حاضر میں ان کے زوال پر نوحہ گری ہے۔لیکن اقبال حالی پر اس لحاظ سے فوقیت رکھتے ہیں کہ ان کے ہاں فارسی غزل سے یہ جذباتی روایت ماخوذ ہے کہ صرف انسان اپنی فلاکت زدہ حالت کے لیے ذمہ دار نہیں بلکہ غزل کی طناز محبوبہ کی مانند خدا بھی اپنے عشاق کی اس حالتِ زار کا مجرم ہے۔

جادہ پیمائی تسلیم ورضا بھی نہ سہی
عشق کی خیر وہ پہلی سی ادا بھی نہ سہی
اور پابندی آئین وفا بھی نہ سہی
مضطرب دل ، صفتِ قبلہ نما بھی نہ سہی
بات کہنے کی نہیں ، تو بھی ہرجائی ہے
کبھی ہم سے کبھی غیروں سے شناسائی ہے

ایک قدامت پرست معاشرے میں نثر میں خدا سے متعلق ایسے خیالات نہیں پیش کیے جاسکتے تھے البتہ شاعری میں ان کی گنجائش تھی اور اقبال نے اس کا خلاقانہ انداز میں استعمال کیا۔

اقبال کا تعلق کسی متمول، صاحب حیثیت خاندان سے نہیں تھا بلکہ وہ اپنے پیش رو شعراء سے اس لحاظ سے مختلف تھے کہ ان کو اپنا ذریعۂ معاش تلاش کرنا پڑا۔ ہندوستان میں وکالت ایک منفعت بخش پیشہ ہے انھوں نے قدرۃً اسی کا انتخاب کیا۔ یہ صراحت ضروری ہے کہ اس دور میں اقبال کی سیاست میں دلچسپی برائے نام تھی لیکن وہ مسائل عالم پر اپنے خیالات وقتاً فوقتاً ظاہر کرتے رہے۔۱۹۲۰ء کے عشرے میں تصنیف ان کی بعض بہترین نظمیں معاصر دنیا کے معاملات ہی سے متعلق ہیں۔ان کی ایک اہم نظم خضرِ راہ ان کی متعدد آراء کی عکاس ہے۔لیکن اس سے بہ حیثیت مجموعی کوئی سیاسی یا فسلفیانہ نظر مرتب نہیں ہوتا البتہ اس نظم میں ان کے اس تصور جہاں کی جھلکیاں ملتی ہیں جو ان کے بعد کے کلام میں پختہ اور منظم شکل میں نمایاں ہوا۔

نظم کا آغاز ایک سبک منظر فطرت سے ہوتا ہے ایک شب دریا کے کنارے شاعر مسائل دوراں کے بارے میں غلطاں و پیچاں ہے۔موجین سطحِ آب پر اس طرح محوخرام ہیں گویا گہوارے میں ایک مضطرب طفل، دفعتاً شاعر کی نظر ایک مسلمان پیغمبر خضر پر پڑتی ہے۔ایک روایت کے مطابق خضر ہی نے چشمۂ آبِ حیات تک سکندر کی رہبری کی

تھی خضر یوم قیامت تک گم کردہ راہ مسافروں کی رہنمائی پر مامور ہیں۔ خضر جیسی نسبتاً غیر معروف شخصیت کا انتخاب ایک دانستہ عمل ہے کیونکہ خضر عزم اور استقلال کا پیکر ہیں اور یہ موضوع اقبال کے کلام میں کلیدی اہمیت کا حامل ہے۔ شاعر خضر سے اس کی راہ نوردی یا مقصدِ حیات، پادشاہی، سرمایہ داری، مزدور، سلطنت وغیرہ کے بارے میں استفسار کرتا ہے ان امور کے بارے میں خضر کے جواب درحقیقت اس دور میں فکرِ اقبال کے غماز ہیں۔ خضر کے بقول انسان کو ہمہ وقت متحرک وفعال اور نئے امکانات کی جستجو میں مستعد رہنا چاہئے۔ کاروانِ زندگی مرحلہ بہ مرحلہ رواں دواں رہتا ہے، ستارے فلک پر تواتر کے ساتھ نمودار ہوتے رہتے ہیں اور گردشِ پیہم سے جامِ زندگی پختہ تر ہوتا جاتا ہے:

پختہ تر ہے گردشِ پیہم سے جامِ زندگی
ہے یہی اے بے خبر رازِ دوامِ زندگی

بادشاہ اور سلاطین مکروفریب سے عوام کا استحصال کرتے ہیں اور ان کو منفعل بنا دیتے ہیں۔ صرف الٰہ واحد رب ہونے کا حق دار ہے اور صرف وہی تمام تر عبادت کے لائق ہے مغرب جس جمہوریت کا منّاد ہے وہ محض ایک سراب ہے۔ سیاست داں دستور، اصلاحات، مراعات، حقوق اور مقنّنہ جیسی پرشکوہ اصطلاحات بطور افیم استعمال کرتے ہیں تاکہ عوام حالتِ خواب میں رہیں۔ (اس دور میں برطانوی حکام نام نہاد تحقیقاتی کمیشن وغیرہ قائم کرتے رہتے تھے جن میں مذکورہ بالا اصطلاحات کا رواج عام تھا) سرمایہ داری استعماریت کا آلۂ کار ہے اور اسے کلیسا کی بھی پشت پناہی حاصل ہے۔ یہ مزدوروں کی برائے نام اعانت بھی کرتے رہتے ہیں تاکہ وہ اس فریب میں مبتلا رہیں کہ اپنی جدوجہد سے انھیں کوئی نفع حاصل ہوگا جبکہ اس کارزار میں پسپائی وشکست ان کا مقدر ہے۔

اقبال کی نظر میں ان مسائل کا حل صرف اسلام ہے البتہ ان کی مراد وہ اسلام نہیں جس میں عرب اور عجم کی تفریق پائی جاتی ہو یا جس اسلام کے نام پر ایران فرنگی آقاؤں کی چاکری کرتا ہو بلکہ ان کے پیش نظر وہ اسلام ہے جو حجاز میں پروان چڑھا اور جو ورثۂ ابراہیمی کا امین ہے:

ربط وضبط ملت بیضا ہے مشرق کی نجات
ایشیا والے ہیں اس نکتے سے اب تک بے خبر
پھر سیاست چھوڑ کر داخل حصار دین میں ہو
ملک ودولت ہے فقط حفظِ حرم کا ایک ثمر

نظم کا آخری شعر فارسی زبان میں ہے اور قرآن کے ایک معروف فقرے پر مشتمل ہے اور یہ مرد مومن کے قلب وذہن کے لیے ایک واضح پیغام ہے:

مسلم استی سینہ را از آرزو آباد دار
ہر زماں پیش نظر ، لایخلف المیعاد دار

یہی اقبال کا غیر متزلزل موقف تھا جس پر وہ اپنی تمام عمر قائم رہے جس مذہب اور عقیدے پر ان کی پیدائش ہوئی تھی اس کا کوئی متبادل کبھی بھی ان کے پیش نظر نہیں رہا۔

ان کے اس دور کے کلام کی ایک امتیازی خصوصیت ان کی رجائیت ہے جو کہ حالی کے مسدس اور خود ان کے شکوہ میں مفقود ہے۔ وہ اس یقین کے علم بردار نظر آتے ہیں کہ پسماندہ ہندوستانی مسلم اقلیت کا واقعی روشن مستقبل ہے ۔گویا پھر کوئی ابراہیم پیدا ہوگا یا پھر کوہ طور پر کوئی نئی تجلی نصیب ہوگی۔ وہ اس سوال کے جواب کے متلاشی ہیں کہ مسلمان ان غیر اسلامی افکار اور نظام سے کیسے نجات پائیں جن کی کوئی گنجائش ان کے عقیدے میں نہیں ہے۔

خضر راہ جیسی روح پرور نظموں میں پاکستانیوں کے لیے ایسا پیغام ہے جو ان کے وجود کو استحکام بخش سکتا ہے البتہ اقبال کے کلام میں پنہاں پر جوش لیکن غیر مربوط اور غیر منظّم بیانات کو بہت زیادہ اہمیت نہیں دینا چاہئے۔ کسی مقدس کتاب کے متن کے مانند کلامِ اقبال کے کسی مصرعے سے قارئین کے کسی بھی نقطۂ نظر کی تصدیق اور توثیق ممکن ہے البتہ یہ امر یقینی ہے کہ اپنے کلام کے توسط سے اقبال ملت اسلامیہ میں ایسا عزم اور ایقان پیدا کرنا چاہتے تھے جس سے ان کی آزاد، خودمختار مملکت کا مطالبہ مضبوط اور مستحکم ہو۔ قطع نظر اس امر کے کہ اس نئی مملکت کی کیا شکل اور نقشہ ہوگا۔

ان کی طویل تر اور نازک نظم طلوع اسلام بھی اسی مثبت رویّے سے عبارت ہے۔ اس کا سن تصنیف ۱۹۲۳ء ہے اور اس کے پس منظر میں کمال اتاترک کا سیاسی عروج ہے۔ اس نظم میں انھوں نے ترکوں کا ایک بہادر قوم کے طور پر تعریف اور توصیف کے ساتھ ذکر کیا ہے۔ ان کا یقین تھا کہ دور جدید میں ترک مسلمانوں کی قیادت کا فریضہ انجام دیں گے۔ طلوع اسلام کے یادگار ابتدائی مصرعے اسی فکر سے مملو ہیں اور اس نظم کا مرکزی موضوع متعین کرتے ہیں:

دلیل صبح روشن ہے ستاروں کی تنک آبی
افق سے آفتاب ابھرا ، گیا دور گراں خوابی
عروق مردۂ مشرق میں خونِ زندگی دوڑا
سمجھ سکتے نہیں اس راز کو سینا وفارابی

اقبال کے امتیازی محاورۂ بیان اور اسلوب کا ذکر کیا گیا، ان کا یہ انداز ابتداء ہی سے ان کی شناخت بن گیا۔ غالباً یہ امر تحقیق طلب ہے کہ اس زبان و بیان میں ایسی کیا صفت ہے جس سے ان کا کلام ایسا مؤثر ہو گیا اور جس نے

ان کے قارئین کو ہمیشہ مسحور رکھا۔

اس ضمن میں اولین نکتہ یہ ہے کہ اقبال کے ہاں جدیدیت کی کوئی گنجائش نہیں۔ان کا محاورۂ بیان علم اوزان اورعروض خالصتاً روایتی ہیں۔بالفاظِ دیگر ہر چند کہ ان کا پیغام تازہ اور جدید ہے لیکن اس کی ترسیل کے لیے انھوں نے کوئی نیا اسلوب اختیار نہیں کیا۔اس ضمن میں انھوں نے صحیح راہ کا انتخاب کیا اور آج تک اردو قارئین ان کے اس فیصلے سے خوش اور مطمئن ہیں کہ وہ معروف روایت سے وابستہ رہے۔درحقیقت نئے تجربوں کا مقام اور محل جدید ادبی رسالے ہیں نہ کہ مقبول عام شعری نشستیں۔

اردو کے بالمقابل فارسی ادبی روایت سے اقبال کو زیادہ مناسبت تھی اور اسی باعث ان کا اردو کلام فارسی تراکیب اور محاورۂ بیان سے مالا مال ہے۔صحتِ زبان کے بعض علمبرداروں نے اسی بنیاد پر اقبال پر شدید اعتراض کیے لیکن یہ خوردہ گیری اقبال کے قارئین کے لیے بے معنی ثابت ہوئی کیونکہ یہ قارئین صحافت کی معمولی زبان کی بہ نسبت مساجد کے شستہ وعظ اور خطبوں سے زیادہ مانوس تھے۔مسلمانوں کے لیے بچپن ہی سے پرشکوہ اور مختصر قوافی، معروف پیکر اور علائم اور قرانی نظر رکھنا چاہئے کہ ایک عام مغربی شخص کے مقابلے میں اردو قاری شاعری کی زبان اور آہنگ سے زیادہ واقف اور باخبر ہوتا ہے۔

اقبال کے کلام میں متنوع لطیف فلسفیانہ اور متصوفانہ عناصر کی نشاندہی کی جاسکتی ہے۔البتہ ان کا مرکزی پیغام متواتر بھی ہے اور غیر مبہم بھی کہ خدا اور قولِ رسولؐ پر ایقان رکھتے ہوئے انسان کو یہ احساس ہونا چاہئے کہ مسلسل کاوش سے وہ اپنے امکانات اور صلاحیتوں کو برائے کار لاسکتا ہے اور اپنی خودی کی شناخت کے ذریعے وہ مرمومن کے منصب پر فائز ہوسکتا ہے۔اقبال کے ہاں خودی کی فارسی اصطلاح کثرت سے مستعمل ہے۔مردِمومن کا ترجمہ نامناسب طور پر فوق البشر کیا گیا ہے گویا کہ یہ نطشے کے تصور Ubermensch سے مستعار ہے۔مردِمومن کا مقام حاصل کرنے کے بعد انسان جبرئیل کا ہمسر ہونے اور تسخیرِ ارض پر قادر ہوجاتا ہے۔

یہ نکتہ اہم ہے کہ طلوع اسلام کا آخری بند کلیۃً فارسی میں ہے لیکن جملوں کی ساخت آسان اور سادہ ہے، فقرے مختصر ہیں اور الفاظ بڑی حد تک اردو سے مماثل ہیں۔غرضیکہ اس بند کی تفہیم میں فارسی آڑے نہیں آتی:

بیا تا گل برافشانیم ومی در ساغر اندازیم
فلک را سقف بشگافیم وطرح نو دراندازیم

۱۹۲۶ء سے قبل اقبال نے عملی سیاست میں حصہ نہیں لیا البتہ ۱۹۲۶ میں پنجاب قانون ساز مجلس کے انتخاب میں وہ بطور امیدوار شریک ہوئے اور غیر معمولی اکثریت سے منتخب ہوئے البتہ جلد ہی وہ اس مجلس کی بے عملی سے مایوس

ہوگئے۔ اگلے سال سائمن کمیشن کا حامی ہونے کی بناء پر ان کا جناح سے اختلاف رائے ہوا۔ جناح اقبال کی سیاسی بصیرت کے قائل نہ تھے اور متعدد مواقع پر انھوں نے دانستہ اقبال کو نظر انداز کیا۔ البتہ ۱۹۳۰ء میں مسلم لیگ کے الہ آباد اجلاس کے صدر اقبال منتخب ہوئے جس سے ان کے سیاسی قد وقامت میں نمایاں اضافہ ہوا۔ اسی اجلاس میں انھوں نے مندرجہ ذیل بیان دیا جس کا بارہا حوالہ دیا جاتا ہے:

''میری خواہش ہے کہ پنجاب ،شمال مغربی سرحد صوبے ، سندھ اور بلوچستان کا وفاق ہو اور ہندوستان کی حدود میں ایک مسلم ہندوستان وجود میں آئے۔''

امر واقعہ یہ ہے کہ اس وقت اقبال کے مذکورہ بالا بیان پر بہت کم توجہ دی گئی۔ گو کہ ان کے بیان کا مقصود وفاق ہند میں ایک علیحدہ سیاسی وحدت کا قیام تھا۔ بعد میں البتہ اسی بیان کی بنیاد پر یہ تاثر عام ہوا ہے کہ اقبال نے نظریۂ پاکستان پیش کیا تھا۔ درحقیقت بعد کے دور میں اس موضوع پر اقبال کے بیانات اس تاثر کو تقویت دیتے ہیں۔ مثال کے طور پر اپنے انتقال سے ایک سال قبل ۱۹۳۷ء میں جناح کے نام اپنے خط میں اقبال رقمطراز ہیں:

''میری رائے میں واحد وفاق پر مبنی نئے دستور کی تجویز بالکل بے سود ہے مسلم صوبوں کا جداگانہ وفاق وہ واحد راستہ ہے جس سے پرامن ہندوستان کی تشکیل ممکن ہے اور اس طرح مسلمان غیر مسلموں کے غلبے سے محفوظ رہیں گے۔''

تخلیق پاکستان سے دس سال قبل ہی اقبال کی وفات ہوگئی اب صرف یہ قیاس کیا جا سکتا ہے کہ اگر وہ اور حیات رہتے تو پاکستان کی تخلیق کے بارے میں ان کی کیا رائے ہوتی۔ ان کے کلام میں تخلیق پاکستان کے موضوع پر کوئی اظہار خیال نہیں ملتا۔

سیاسی، مذہبی اور فلسفیانہ امور پر اقبال کی آراء کا واضح اظہار ان کی مشہور نظم ساقی نامہ میں ہے۔ یہ طویل نظم ۱۹۳۶ء میں شائع ہوئی۔ طلوع اسلام کی مانند اس نظم میں رجائیت کا پہلو غالب ہے اور اس میں اسلام کے روشن مستقبل کی نوید ہے۔ نظم کا آغاز مناظر فطرت کی تصویر کشی سے ہوتا ہے۔ یہاں بنیادی استعارہ جوئے کہستاں ہے جو پہاڑ کی چوٹی پر پگھلتی برف سے نکلتی ہوئی ایک ایسی تیز اور تند موج میں تبدیل ہو جاتی ہے جو اپنی راہ میں حائل تمام رکاوٹوں کو تہہ وبالا کر دیتی ہے۔ اس کی کیفیت یہ ہے:

وہ جوئے کہستاں اچکتی ہوئی
اٹکتی ،لچکتی ، سرکتی ہوئی
اچھلتی ، پھسلتی ، سنبھلتی ہوئی
بڑے پیچ کھاکر نکلتی ہوئی
رکے جب توسل چیردیتی ہے یہ
پہاڑوں کے دل چیر دیتی ہے یہ

اقبال کے مطابق یہ طلوع صبح ہے اور ایسے جہان کی تشکیل جس میں سلاطین اور شہنشاہوں کا کوئی مقام نہیں ۔اسی طرح فرسودہ ،کہنہ اسلامی رسوم ورواج کا بھی گزر نہیں۔

وہ صوفی کہ تھا خدمت حق میں مرد
محبت میں یکتا ، حمیت میں فرد
عجم کے خیالات میں کھو گیا
یہ سالک مقامات میں کھو گیا

ساقی نامہ بلاشبہ ایک پیچیدہ نظم ہے اور اس کا علمی تجزیہ مختلف تناظرات میں کیا گیا ہے۔اردو میں ایسی نظمیں خال خال ہیں جو قارئین کے ایسے لطف اور توجہ کا مورد رہی ہوں۔البتہ یہ صراحت لازم ہے کہ اقبال کا پورا کلام اس کیفیت کا حامل نہیں ہے۔ان کی مختصر غزلیں صرف چند اشعار پر مشتمل ہیں اور یہ کلامِ اقبال کا مقبول ترین حصہ ہیں۔ مندرجہ ذیل نظم اس کی بہترین مثال ہے کہ اقبال اپنے کلام میں کیسے متنوع اور پیچیدہ بلکہ متضاد خیالات کو باہم دگر پیوست کر کے عام قارئین کے سامنے پیش کر دیتے ہیں۔ان افکار کی تفہیم کے لیے فضلاء کو ایک عرصہ درکار رہوتا ہے:

پھر چراغ لالہ سے روشن ہوئے کوہ ودمن
مجھ کو پھر نغموں پہ اکسانے لگا مرغِ چمن
پانی پانی کر گئی مجکو قلندر کی یہ بات
تو جھکا جب غیر کے آگے نہ من تیرا نہ تن

انگلستان میں مستقبل کی تعلیم کا لائحہ عمل طے کرنے کے حالیہ مباحث میں ایک یہ تجویز بھی سامنے آئی کہ ثانوی اسکول کے نصاب سے بائرن ، شیلے اور ٹینی سن کے کلام کو خارج کر دیا جائے۔اس تجویز سے محرکین نے ان شعراء کو بے رحمی کے ساتھ ایسے ''مردہ سفید فام مردوں'' سے تعبیر کیا جن کے ہاں مروج اقدار آج کے معاشرے کے

لیے بامعنی نہیں ہیں۔اس تجویز کو رد کرتے ہوئے اور ٹینی سن کے پر پوتے نے یہ نکتہ پیش کیا کہ ان شعراء کی عظمت نسل در نسل تسلیم کیا گیا ہے۔اور ان کی اقدار کے باوصف ان کا شمار ہمیشہ عظیم شعراء میں کیا جائے گا۔اسی نکتے کا اطلاق اقبال پر بھی ہوتا ہے ان کی شاعرانہ عظمت دیرپا ہے اور ان کا پیغام ہماری اور آئندہ نسلوں کے لیے بامعنی بلکہ آفاقی ہے۔

ڈاکٹر طاہر حمید تنولی، لاہور

علامہ اقبال کے پہلے خطبہ کے اہم نکات

علامہ اقبال نے پہلے خطبے میں درج ذیل نکات بیان کیے ہیں:

۱۔ خطبات کا مقصد

(۱) ہماری زندگی کو اعلیٰ نصب العین مقاصد سے بہرہ ور کرنے کے لیے مذہب کے حقائق کا فہم ناگزیر ہے۔

(۲)۔ جدید سائنسی تحقیقات کے بعد مذہبی حقائق کی تفہیم ناگزیر ہے

(۳)۔ اشتراکی روس میں مادیت اور مذہب مخالف رجحانات کا چیلنج

(۴)۔ چونکہ مسلم مفکرین جدید مادی رجحانات سے متاثر ہو کر قرآن مخالف فکر اختیار کر رہے ہیں لہٰذا تشکیل جدید/خطبات ناگزیر ہیں۔

(۵)۔ مغرب سے مرعوبیت و مغلوب ہونے کے خطرے کا ازالہ ضروری ہے۔

(۶)۔ خطبات کا مقصد اسلام کو نوع انسانی کے لیے عالم گیر پیغام حیات کے طور پر پیش کرنا ہے۔

۲۔ کائنات اور انسان کے تعلق کے بارے میں قرآن حکیم کا نقطۂ نظر

(۱)۔ کائنات اور انسان کے تعلق کے بارے میں قرآن حکیم کا نقطۂ نظر

(۲)۔ قرآن حکیم انسان سے کائنات اور خدا کے تعلق کی آفاقی روحانی بنیاد فراہم کرتا ہے

(۳)۔ قرآن حکیم روحانی اور مادی پہلو کے تضاد و تصادم کی نفی کرتا ہے

(۴) انسان ایک تخلیقی فعالیت اور خدا کے مقاصد کی تکمیل کا اہل ہے

(۵)۔ مسلم فکر ماضی میں قرآنی تصور کو نہ سمجھ سکی اور اس سے دوری پر جا پڑی

۳۔ انسان کے خدا کے ساتھ تعلق کی روحانی اساس قابل فہم اور قابل مشاہدہ ہے

(۱)۔ انسان ایمان کے ذریعے خدا سے تعلق استوار اور معرفت حاصل کر سکتا ہے

(۲)۔ انسانی فکر بھی ایمان کی حقیقت کے عرفان میں معاون ہے

(۳)۔ مذہب محض تصور یا کھوکھلا عقیدہ نہیں بلکہ زندہ تجرباتی حقیقت ہے

(۴)اسلام میں عین اور حقیقت میں مخالفت یا تضاد نہیں

(۵)۔اسلام میں نفسی کیفیات وارادت کی تفہیم کا آغاز حضورؐ نے فرمایا

(۶)۔ایمان کو تجربہ بنانے کے لیے مغربی کی بجائے اسلامی فکر ہی بہتر بنیاد فراہم کرتا ہے

(۷)۔کانٹ اور غزالی کے طریق کار میں فرق

۴۔ روحانی مشاہدے سے زندگی کی ایمانی بنیاد کی توثیق ہوتی ہے

(۱)انسانی فکر وہ صلاحیت ہے جو ایمان کی حقیقت اور تاثیر کا ادراک کرسکتی ہے

(۲)۔فکر کی وہ صلاحیت جو ایمان کی حقیقت کا مشاہدہ کرتی ہے قلب ہے

۵۔ زندگی کے چیلنجز کا مقابلہ اور اپنی اساس پر استقامت عقلی دلائل سے نہیں بلکہ ایمان سے ممکن ہے

(۱)۔زندگی کے دکھوں کے ماحول میں انسان کا استحکام کس طرح؟

۶۔ روحانی تجربے کے ولیم جیمز کی بیان کردہ خصوصیات: علامہ اقبال کی تحسین وتنقید

(۱)۔جدید نفسیات اور روحانی مشاہدے کی خصوصیات

اب ان نکات کی وضاحت کی جاتی ہے:

ا۔خطبات کا مقصد

ا۔اعلیٰ نصب العین کے لیے مذہب کے حقائق کی تفہیم کی ناگزیریت

علامہ فرماتے ہیں کہ شاعری اور فلسفہ کے برعکس دین کا مقصد انسان کی باطنی اور ظاہری زندگی کو بدلنا اور اس میں بہتری پیدا کرنے کے لیے رہنمائی کرنا ہے۔لہٰذا ایسے تمام حقائق جو دین کی تعلیمات اور تصورات کی تفہیم کے لیے ناگزیر ہیں انہیں ادھورا نہیں چھوڑا جاسکتا۔اکیونکہ ہم زندگی اور اپنے اعمال اور رویوں کی بنیاد کسی مبہم تصور یا مشتبہ اصول پر نہیں رکھ سکتے۔سائنس جو زندگی کے کسی ایک آدھ شعبے ہی کے سوالات کے جوابات فراہم کرتی ہے بھی کسی نہ کسی عقلی اساس پر استوار ہوتی ہے۔مذہب جو پوری زندگی کے مسائل کا احاطہ کرتا ہے بدرجہ اولیٰ اس توجہ کا مستحق ہے

---

1. Now, since the transformation and guidance of man's inner and outer life is the essential aim of religion, it is obvious that the **general truths** which it embodies must **not remain unsettled**. *Reconstruction*, p.1-2

2. **Religion** is not a departmental affair, it is neither mere thought, nor mere feeling nor mere action, it is an expression of the whole man. Thus, in the evaluation of religion, philosophy must recogze the central position of religon and has no other alternative but to admit it as something focal in the process of reflective synthesis. *Reconstruction,* p.2

کہ مختلف بلکہ ہم مخالف تجربات کے درمیان موافقت تلاش کرے۔لیکن دین اور ایمان کی عقلی اساس کی تلاش میں فلسفے یا سائنس کو مذہب پر برتری نہیں دی جاسکتی۔فلسفہ اور سائنس دینی حقائق کو اپنی حدود میں رہتے ہوئے سمجھنے کی کوشش کر سکتے ہیں۔کیونکہ فلسفہ اور سائنس انسانی ہستی کے کسی نہ کسی پہلو کو مخاطب بناتے ہیں جبکہ دین انسان کی پوری شخصیت جس میں احساس وجذبہ، ارادہ اور فکر شامل ہیں کا احاطہ کرتا ہے۔۲لہٰذا جب بھی اس حوالے سے غور وفکر کیا جائے گا تو مذہب کی اسی جامعیت اور انسانی زندگی میں ہمہ گیر کردار کی وجہ سے اسے دیگر شعبہ ہائے علم یا ذرائع علم کے مقابلے میں زیادہ مرکزی اور محوری حیثیت دی جائے گی۔۳

۲۔جدید سائنسی تحقیقات کے بعد مذہبی حقائق کی تفہیم

علامہ فرماتے ہیں کہ جوں جوں انسان کا علم آگے بڑھتا ہے اس کے نقطۂ نظر میں تبدیلی ہی نہیں آتی وسعت بھی پیدا ہوتی ہے۔ماحول اور کائنات پر آج دور کے انسان نے جس طرح اختیار حاصل کیا ہے اور اپنی علمی تحقیقات اور دریافتوں کے ذریعے فطرت کی قوتوں پر برتری پانے کے بعد اسے ایک نیا اعتماد ملا ہے اس کے نتیجے میں نئے نئے نظریات، تصورات اور نقطہ نظر بھی سامنے آرہے ہیں۔جس کا نتیجہ یہ ہے کہ نئے نظریات، تصورات اور تحقیقات کے نتیجے میں پرانے مسائل پر از سر نو نئے انداز سے غور کیا جارہا ہے لیکن اس کے ساتھ ساتھ کچھ نئے مسائل بھی جنم لے رہے ہیں۔انسان نے سائنس کے میدان میں تحقیق کے بعد فطرت کی قوتوں پر اس حد تک تصرف حاصل کرلیا ہے کہ آج انسانی عقل زمان ومکاں اور علت اور معلول کی حدود پھلانگنے کے قابل نظر آتی ہے۔سائنسی فکر کی ترقی نے علم اور ادراک کے تصورات میں بھی تبدیلی پیدا کردی ہے۔۴اس کی ایک مثال آئن سٹائن کا دیا گیا نظریہ اضافیت ہے جس نے کائنات کے بارے میں ہمارے نقطہ نظر کو بالکل بدل دیا ہے۔ان بدلے ہوئے حالات اور نئے علمی فکری اور تحقیقی تناظر میں مذہب کے حقائق کو پرانے فہم تک ہی محدود نہیں رکھا جاسکتا۔آج ضرورت ہے کہ دینی حقائق کی تفہیم کے لیے نئے زاویوں سے بھی غور کیا جائے تاکہ انسان کی جدید علمی تحقیقات اور اس کا فہم باہم ہم آہنگ رہیں اور کسی بھی سطح پر اسے دینی حوالے سے پسماندگی کا سامنا نہ کرنا پڑے۔۵

۳۔ مادیت اور مذہب مخالف رجحانات کا چیلنج

علامہ کہتے ہیں کہ ان بدلے ہوئے حالات میں مسلمانوں کی نئی نسل اسلام کی تعبیر نو کا تقاضا کررہی ہے۔

4. seems as if the intellect of man is outgrowing its own most fundamental categories-time, space, and causality. With the advance of scientific thought even our concept of intelligibility is undergoing a change. *Reconstruction,* p.6

5. *Reconstruction,* p.6

ایشیااورافریقہ میں مسلمانوں کی نئی نسل کے ان رجحانات کونظرانداز نہیں کیا جاسکتا ہے۔تاہم وہ تمام عوامل جومسلمانوں میں اس طرح کے رجحانات کوجنم دے رہے ہیں بھی ہمیں زیرغورلانے چاہئیں۔مثلا یہ کہ یورپ میں مختلف علمی،فکری رجحانات کس طرح پیدا ہوئے اورکس طرح آگے بڑھ رہے ہیں۔یورپ کی علمی،فکری تحقیقات کے حاصل کیا ہیں اور ان کا مسلمانوں کی الہیاتی فکر پر کیا اثر مرتب ہوسکتا ہے۔کیا ہم یورپ کی علم،فکراور تحقیق کواپنی فکر کی تشکیل نو کے لیے استعمال کرسکتے ہیں اوراس سے کوئی مدد لے سکتے ہیں یہ وہ پہلو ہیں جنہیں نظرانداز کرکے دور جدید میں بقاممکن نہیں ہوگی اس کے ساتھ ایک اور بڑا چیلنج وسط ایشیا یعنی اشتراکی روس میں پیدا ہونے والا پراپگنڈا بھی ہے۔جس کے اثرات جوبنیادی طور پر مادیت پر مشتمل ہے مسلم دنیا تک بھی پہنچ رہے ہیں۔علامہ اشتراکی روس کی مادیت کے اثرات کوبھی اسلام کی الہیات فکر کی تشکیل جدید کے لیے ایک بڑا چیلنج قرار دے رہے ہیں۔[۶]

۴۔ مسلم مفکرین کے مادی وقرآن مخالف رجحانات اور مذہبی فکر کی تشکیل جدید کی ناگزیریت

اشتراکی روس کے مادیت کے رجحانات کے مسلم معاشرے پر ہونے والے اثرات کی مثال کے طور پر علامہ اقبال ترک شاعر توفیق فطرت کا ذکر کرتے ہیں۔توفیق فطرت جوتوفیق نظمی کے نام سے بھی مشہور تھا جدید ترک شاعری کے بانیوں میں شمار کیا جاتا ہے۔جس کا مجموعہ کلام رباب شکستہ کے نام سے چھپا۔توفیق فطرت ترکی میں سیکولر رجحانات کوفروغ دینے والے بڑے ناموں میں شامل ہیں توفیق فطرت نا صرف معاصر مادیت اور سیکولر اثرات سے متاثر ہوکے شاعری لکھی بلکہ برصغیر کے عظیم شاعر مرزا عبدالقادر بیدل اکبرآبادی کے افکار کوبھی اپنی تائید کے لیے استعمال کیا۔علامہ کہتے ہیں اندریں حالات جب مسلمانوں کی نسل نو کے اذہان نا صرف مادی اور غیر اسلامی افکار سے متاثر ہورہے ہیں بلکہ خود مسلم اکابر شخصیات کوغلط طور پر اس کی تائید کے لیے استعمال کررہے ہیں ہمیں اسلام کی اساسیت کا ازسرنو جائزہ لے کران کی تشکیل نو کرنی چاہیے۔[۷]

۵۔ مغرب سے مرعوبیت ومغلوب ہونے کے خطرات

علامہ مسلم دنیا کے اس بڑے بحران کا ذکر کرتے ہوئے کہ آج علوم کا بہاؤ مغرب سے مشرق کی طرف ہوچکا ہے جبکہ ایک وہ زمانہ تھا جب علوم کا بہاؤ اسلامی دنیا سے مغرب کی طرف تھا اور مغربی فکر اسلامی دنیا سے روشنی اور تحریک حاصل کرتی تھی۔علامہ اس کا سبب یہ بیان کرتے ہیں کہ گذشتہ پانچ سو برسوں سے اسلامی فکر عملی طور پر جمود کا شکار

---

6. *Reconstruction,* p.6

7. *Reconstruction,* p.6

8. *Reconstruction,* p.6

ہے۔۸ یہی وجہ ہے کہ جب مغرب میں علوم کی بے پناہ ترقی ہوئی تو دنیائے اسلام ذہنی طور پر مغرب کی طرف بڑھنے کے علاوہ کوئی چارہ نہیں رہا۔ اس لحاظ سے اس میں مثبت پہلو موجود ہے کہ یورپی ثقافت فکری طور پر اسلام ہی کے چند اہم ثقافتی پہلوؤں کی ترقی یافتہ شکل ہے۔ یہاں یہ نکتہ قابل غور ہے کہ علامہ مغرب کو اسلام کی توسیع نہیں قرار دے رہے مغرب کی جدید علمی ترقی کو اسلام کی فکر کی توسیع نہیں قرار دے رہے بلکہ مغرب کی تمام تر علمی ترقی کے مثبت پہلوؤں کو اسلام کی ثقافت اور تہذیب کے چند پہلوؤں کا تسلسل قرار دے رہے ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ علامہ اس سے بھی خائف ہیں کہ یورپی تہذیب کی ظاہری چمک دمک مسلمانوں کو اپنے سحر میں گرفتار کر کے مغالطوں کا شکار نہ کر دے اور وہ مغربی تہذیب کے اسلام مخالف روح سے ناآشنا ہوتے ہوئے اس کے ہی پیروکار نہ بن جائیں۔۹ کیونکہ اقبال کے نزدیک تہذیب حاضر کی عطا کردہ آزادی باطن کی گرفتاری ہے اور جلوۂ دانشِ فرنگ کی خیرہ کاری سے تحفظ کا راستہ اپنی فکر کی روشنی کو سرمہ چشم بنانا ہے۔ علامہ فرماتے ہیں کہ گذشتہ پانچ سو سال سے جب ہم ذہنی غفلت کا شکار تھے وہی مسائل مسلمان فلسفیوں اور سائنسدانوں کی توجہ کا باعث تھے، کا مرکز تھے مغرب نے ان پر بہت سنجیدگی سے غور کیا اور تحقیقات کو آگے بڑھایا۔ یعنی مسلمانوں کے ہاں الہیات کی تکمیل کے دور کے بعد سے جب کہ وہ غفلت کا شکار تھے انسانی فکر اور تجربے میں فروغ کا عمل جاری رہا اور یہ فروغ اور تسلسل مشرق کے بجائے، مسلم دنیا کے بجائے مغربی دنیا میں ہوا۔۱۰

۶۔ اسلام نوع انسانی کے لیے عالم گیر پیغام حیات

خطبات کے مقاصد بیان کرتے ہوئے علامہ فرماتے ہیں کہ میرے پیش نظر اس نقطہ کی وضاحت ہے کہ نوع انسانی کے لیے اسلام کو عالمگیر پیغام حیات کے طور پر پیش کیا جائے۔۱۱ لہٰذا اس کے لیے اسلام کے ان اساسی تصورات کو موضوع بحث بنانے کی ضرورت ہے جو یہ مقصد پورا کریں اور اسلام کا انسانیت کے لیے عالمگیر پیغام

---

9. There is nothing wrong in this movement , for European culture , on its intellectual side , is only a further development of some of the most important phases of the culture of Islam . Our only fear is that the dazzling exterior of European culture may arrest our movement and we may fail to reach the true inwardness of that culture

10.Reconstruction , p.6 20.

10.Reconstruction , p.6 . 21

11.propose to undertake a philosophical discussion of some of the basic of ideas of Islam , in the hope that this may , at least , be helpful towards

حیات ہونا واضح ہو سکے۔ان مباحث کی ترجیحات کو طے کرتے ہوئے علامہ نے سرفہرست جس تصور کو اپنی گفتگو کے موضوع کے طور پر منتخب کیا وہ حواس کے ذریعے حاصل ہونے والا علم اور روحانی مشاہدہ ہے یعنی علامہ روحانی مشاہدے کے ذریعے حاصل ہونے والے علم یا وحی کے ذریعے میسر آنے والی ہدایت کی اہمیت، موثریت اور ثقاہت کو حواس کے ذریعے حاصل ہونے والے علم سے بھی بڑھ کر ثابت کرنا چاہتے ہیں۔ظاہر ہے یہ اس لیے ضروری ہے کہ اسی صورت میں انسانیت کے سامنے اسلام کو عالمگیر پیغام حیات کے طور پر پیش کیا جا سکے گا جس کی اساس وحی یا پیغمبرانہ روحانی مشاہدہ ہے۔[۱۲]

کائنات اور انسان کے تعلق کے بارے میں قرآن حکیم کا نقطہ نظر

ا۔ کائنات کی عقلی بنیادوں پر تحقیق و تعبیر کا آغاز اور اسلام

علامہ فرماتے ہیں کہ اسلام نے عقل کی اہمیت پر اس حد تک زور دیا کہ تاریخ انسانی میں عقل کو کائنات کے اسرار کی تفہیم کے لیے استعمال کرنے کا جتنا موثر انداز آغاز اسلام نے کیا اس کی کوئی مثال تاریخ میں نہیں ملتی۔ کہا جا سکتا ہے کہ عقلی بنیادوں پر غور و فکر کو آگے بڑھانے کا آغاز خود حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:[۱۳] اس مفہوم کی دعائیں ہمیں حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم سے تواتر کے ساتھ ملتی ہیں جن میں آپ نے اللہ رب العزت سے اشیاء کی حقیقت کے علم کا سوال کیا بلکہ اس کی تائید خود قرآن کریم میں ان آیات سے ہوتی ہے۔ جو حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے پیغمبرانہ منصب کو بیان کرتی ہیں ان آیات میں تلاوت آیات، تزکیہ نفس، تعلیم علم و حکمت کے بعد پیغمبر صلی اللہ علیہ وسلم کا یہ منصب بیان کیا گیا **و یعلمکم مالم تکونو ا تعلمون** کہ رسول تمہیں وہ کچھ سکھاتے ہیں جو تم نہیں جانتے۔ یعنی ہر نہ جانی جانے والی حقیقت کو دریافت کرنے اور جان لینے کی آرزو اور رویہ خود قرآن حکیم نے براہ راست مسلم شعور میں پیدا کیا یہی وہ رجحان تھا جس کے تحت صوفیا اور غیر صوفی متکلمین اور مفکرین نے بعد میں جو تحقیقی کاوشیں کی وہ مسلم تہذیب کی بنیاد بھی بنی اور انسانی فکری تاریخ کا ایک روشن باب قرار پائیں۔انہوں نے افکار کے ایسے نظام قائم کیے جو علم، فکر، تحقیق اور جستجو کے ساتھ مسلم ذہن کی سچی پابستگی کا اظہار ہے۔تاہم جیسا کہ اصول ہے کہ کوئی بھی فکر اپنے زمانے کی فطری پابندیوں سے بڑھ کر نہیں کاوش کر سکتی۔اسی طرح اسلام کی الہیاتی فکر کے آگے ایک مخصوص حد سے

---

12 Proper understanding of the meaning of Islam as a message to humanity.

.Reconstruction , p.7

13.Reconstruction , p.7

14. The search forrational foundations in Islam may be regarded to have begun with the Prophet himself. 10.Reconstruction , p.2

آگے نہ بڑھنے کا سبب وہ زمانی حد بندیاں بھی تھیں جن کی وجہ سے مسلم ذہن اس حد تک اپنی فکر کو بارور نہ کر سکے جو ان پابندیوں کے نہ ہونے کے باعث وہ کر لیتے۔[۱۴] اس کی ایک بڑی مثال مسلم فکر پر یونانی فلسفے کا اثر ہے۔ اگرچہ یونانی فکر و فلسفے نے مسلمانوں کو فکر میں وسعت پیدا کی نہیں سوچنے کے نئے زاویے دیے لیکن اس کا ایک بڑا نقصان یہ ہوا کہ قرآن حکیم کے بارے میں مسلم مفکرین کی سوچ دھندلا گئی۔ یعنی اکثر مسلم مفکرین نے قرآن حکیم کو جب یونانی فکر ہی کی روشنی میں سمجھنے کی کوشش کی تو اس کے نتیجے میں ان کی فکر پر قرآن مجید کے اپنے حاصلات کے بجائے یونانی فکر کے اثرات غالب رہے۔ سقراط کے نزدیک انسان کے مطالعے کا موضوع انسان ہے لہٰذا اس نے انسان پر ہی اپنی توجہ مرکوز رکھی اور کائنات کو اپنے مطالعے کا موضوع بنانے کے قابل نہیں سمجھا۔ یہ فکر قرآن حکیم کے منافی ہے کیوں کہ قرآن حکیم تو شہد کی معمولی مکھی پر وحی کرنے اور مچھر کے پرتک کو مثال کے طور پر بیان کرنے کا ذکر کرتا ہے۔ قرآن مجید اپنے قاری کو ہواؤں کے تغیر و تبدل، دن رات کی گردش، بادلوں کی آمد و رفت، تاروں بھرے آسمان، فضا میں موجود سیاروں، بروج، زندگی اور اس کے مختلف پہلوؤں، حتی الغرض کہ کائنات کے ہر ہر مظہر پر غور و فکر کرنے کی تلقین کرتا ہے تا کہ اس پر یہ حقیقت منکشف ہو سکے کہ اللہ کا تخلیق کردہ یہ کہانی قدرت باطل نہیں بلکہ حق ہے۔

افلاطون جو سقراط کا سچا پیروکار اور شاگرد اس نے بھی اپنے استاد کی پیروی میں جو اس کے ذریعے حاصل ہونے والے ادراک کا ناقابل اعتماد ٹھہرایا اور کہا کہ حواس کے ذریعے حاصل ہونے والا ادراک محض ایک رائے کی بنیاد تو بن سکتا ہے حقیقی علم فراہم نہیں کر سکتا۔ سقراط کے شاگرد افلاطون کا یہ تصور قرآن حکیم کی تعلیم کی کھلی نفی ہے۔ کیونکہ قرآن حکیم نے سماعت اور بصارت کو نہ صرف اللہ کی طرف سے دو عظیم عطائیں قرار بلکہ انہی کی بنیاد پر انسان کو اپنی کارکردگی کے لیے اللہ کے سامنے جوابدہ ٹھہرایا۔ قرآن مجید کی آیت کا حوالہ سورۂ ملک۔ یونانی فکر جو کلاسیکی انداز کی حامل تھی میں الجھ جانے کی وجہ سے اول دور کے مسلم مفکرین اور قرآن حکیم کے علماء قرآن مجید کے تصور علم، مزاج اور تسخیر کائنات کی تعلیم سے غافل ہو گئے۔[۱۵] انہوں نے قرآن مجید کا مطالعہ بھی یونانی فلسفہ کی روشنی میں کیا۔ حتی کہ کم و بیش ۲۰۰ سال بعد مسلمانوں کو اس حقیقت کا کچھ کچھ احساس ہوا کہ قرآن حکیم کی روح غیر کلاسیکی یعنی یہ یونانی فکر سے بالکل مختلف ہے۔ جیسے جیسے مسلم دانشوروں میں یہ ادراک پیدا ہوا وہاں ایک علمی اور ذہنی بغاوت نے بھی جنم لیا

---

14. This is what the earlier Muslim students of the Qur'an completely missed under the spell of classical speculation . They read the Qur'an in the light of Greek thought . It took them over two hundred years to perceive though not quite clearly that the spirit of the Qur'an was essentially anti - classical . Reconstruction , p.2,3

15.Reconstruction , p.2,3 .

اگر چہ اس فکری انقلاب کی اہمیت مکمل طور پر آج تک ہم پر منکشف نہیں ہوسکی مثلاً مسلم تاریخ میں بتدریج جنم لینے والی اس تبدیلی کے اثرات ہمیں امام غزالی کے ہاں نظر آتے ہیں جنہوں نے اس فکری انقلاب اور اپنے ذاتی تجربات کی بنیاد پر تمام علوم کو تشکیک پر مبنی قرار دیا۔ نتیجتاً اپنی فلسفیانہ تشکیک جو انہوں نے تحافۃ الفلاسفہ میں بیان کی تھی کو مذہب کی حقانیت کی بنیاد کے طور پر پیش کیا علامہ اقبال کے نزدیک یہ مذہب کے لیے غیر محفوظ بنیاد ہے۔ جسے قرآن حکیم کی روح کے مطابق قرار نہیں دیا جاسکتا۔[۱۶] لیکن اگر امام غزالی کی تصانیف کا بنظر غائر مطالعہ کیا جائے تو ہم دیکھتے ہیں کہ امام غزالی نے فلسفیانہ تشکیک کی بنیاد پر وحی کے علاوہ دیگر علوم کو حقیقت کی معرفت کے لیے ناکافی قرار دیا اور صرف وحی کو حقیقی ذریعے علم قرار دیا جس کی اساس انہوں نے صوفیانہ تجربے اور وجدان پر رکھی جیسا کہ ان کی کتاب المنقذ من الضلال میں ان کے اپنے تجربات کے حالات کی روشنی میں بیان کی گئی ہے۔

15.Reconstruction , p.2,3

ڈاکٹر مشتاق احمد گنائی

اقبال کے فکر وفن میں جدید سائنسی، اخلاقی اور روحانی تصورات
ایک تحقیقی جائزہ

علامہ اقبال کی شاعری میں ہمیں جدید سائنسی نظریات کے متعلق اکثر و بیشتر ایسے اشارات و کنایات ملتے ہیں جو بادی النظر میں ایک شاعر کی الہامی بصیرت (Prophetic Vision) محسوس ہوتے ہیں لیکن اُن کے انگریزی خطبات The Reconstruction of Religious Thought in Islam دیگر خطبات اور مکتوبات کا تجزیہ کرنے کے بعد الہامی بصیرت کے ساتھ ساتھ اس حوالے سے اُن کے وسیع مطالعہ کا بھی ادراک حاصل ہوتا ہے۔ وہ سائنس کے کائنات سے متعلق انکشافات کو عقل اور مذہب کی واردات روحانی، وجدان اور عشق سے موسوم کرتے ہیں یوں سائنسی اختراعات میں بھی ایک خاص روحانیت کے متلاشی دکھائی دیتے ہیں۔ دراصل انھوں نے جدید سائنسی نظریات کا گہرائی کے ساتھ مطالعہ کر کے اس پر سنجیدہ غور وخوض بھی کیا ہے اور پھر اسی غور وخوض کے نتیجے میں آپ مذہب کے بعض بنیادی مسائل کو سمجھنے کے لیے سائنس کا مطالعہ ناگزیر قرار دیتے ہیں۔
پیش نظر مقالے میں اقبال کے اسی وسیع نظریئے کو اُجاگر کرنے کی ایک تحقیقی کوشش کی گئی ہے۔
علامہ اقبال کے کلام کا سب سے نمایاں اور منفرد پہلو اس کی اثر افرینی ہے جس نے دلوں کو ایک ولولۂ تازہ عطا کیا جیسا کہ انھوں نے کو دکہا ہے۔

اِک ولولہ تازہ دیا میں نے دلوں کو
لاہور سے تاخاک بخارا و سمر قند[۱]

شاعر مشرق علامہ اقبال اردو زبان وادب کے کوئی روایتی فلسفی نہیں ہیں بلکہ اُن کا دانشورانہ شعر وادب اور فلسفہ ماضی وحال کے واضح علمی تصورات کا ایک جامع تبصرہ کہلانے کا مستحق ہے۔ آپ عصری حوادثات وواقعات کی خوب آگہی رکھتے ہیں اور اسی لئے واضح طور پر یہ اعلان کرتے ہیں۔

عذاب دانش حاضر سے باخبر ہوں میں
کہ میں اس آگ میں ڈالا گیا ہوں مثل خلیل[۲]

اس لئے اُن کی نظر ہمیشہ مستقبل کے امکانات پر مرکوز رہتی ہے اور ببانگِ دُہل وہ ہمیں یہ ذہن نشین کراتے ہیں کہ

یادِ عہد رفتہ میری خاک کو اکسیر ہے
میرا ماضی میرے استقبال کی تفسیر ہے
سامنے رکھتا ہوں اُس دورِ نشاط افزا کو میں
دیکھتا ہوں دوش کے آئینے میں فردا کو میں[۳]

درحقیقت اُن کی روشن دماغی اور حقیقت شناسی کا تعلق زیادہ تر اُن کی مستقبل پسندی کے رجحانات سے ہے اسی لئے گذشتہ صدی کے چند اہم ترین سائنسی حقائق اور فلسفیانہ مسائل پر اُن کی نظر نہ صرف گہری ہے بلکہ اس پر ناقدانہ تبصرہ کر کے انھوں نے ہمیں مستقبل میں سائنسی رمز شناسی کے لئے کافی حد تک آگہی بھی فراہم کی ہے۔ آپ یقیناً بیسویں صدی کے ایک ایسے اولیّن مُسلم فلسفی اور مفکر ہیں جنھوں نے جدید علوم کا گہری نظر سے مشاہدہ کرنے کے بعد اسے قرآنی فکر کی کسوٹی (Critarian) پہ پرکھا ہے۔ اور پھر معاندوانہ رویئے کے بجائے محض علمی رویئے کو مدنظر رکھا ہے۔ شاعر مشرق کی یہ منظّم فکر ہمیں اُن کے معروف انگریزی خطبات کے علاوہ اردو اور فارسی کلام میں نکھر کے سامنے آجاتی ہے۔ اپنی متذکرہ بالا تصانیف میں علامہ ''وقت'' (Time) کے چیلنجز کو سائنسی اور فلسفیانہ سطح پر قرآنی علم کی مناسبت سے بیان کرتے ہیں۔ اُمت مسلمہ کے اس عظیم نابغہ (Genius) نے اپنی تصانیف میں مدلّل طور پر قرآن حکیم کی علمی اور عملی نوعیت کی طرف اشارہ کر کے اس حوالے سے بہت سارے ثبوت و براہین کی نشاندہی کی ہے، اس لئے عقل و تدبر رکھنے والے لوگ قرآن حکیم کی آیت مبارکہ کے مطابق ہمیشہ ان نشانیوں کو دیکھ کر بے ساختہ پکار اٹھتے ہیں ربنا ما خلقت هذاباطلا یعنی اے ہمارے رب! آپ نے یہ ساری کائنات فضول پیدا نہیں کی ہے۔ علامہ اپنی فکر کے مطابق اس آیتِ قرآنی کی توضیح کرتے ہوئے خطبات میں بیان کرتے ہیں کہ دنیا میں وسعت اور بڑھنے کی صلاحیت موجود ہے بلکہ ہم کائنات میں اہم تبدیلیاں بھی دیکھتے رہتے ہیں اور لیل و نہار کی حرکت کے ساتھ ہم زمانے کا خاموش اُتار چڑھاو کا بھی مشاہدہ کرتے رہتے ہیں۔

تھیں پیشِ نظر کل تو فرشتوں کی ادائیں
آئینہ ایام میں آج اپنی اداء دیکھ
سمجھے گا زمانہ تری آنکھوں کے اشارے
دیکھیں گے تجھے دور سے گردوں کے ستارے[۴]

نیز علامہ اقبال کے مطابق سائنس ابھی اُن حقائق تک مکمل طور پر نہیں پہنچ پایا ہے جن حقائق اور واردات کی

نشاندہی قرآن حکیم نے آج سے چودہ سوسال پہلے کر کے رکھی ہے اسلئے کہ سائنسی انکشافات واختراعات آئے دن بدلتے رہتے ہیں۔آج ایک سائنسی ایجاد حقیقت دکھائی دیتی ہے کل وہی مفروضہ ثابت ہوتی ہے مگر حقائق کے لئے جستجو جاری رکھنا اُن کے یہاں عبادت ہی سمجھی جاسکتی ہے۔اس لئے اُنھیں ہمیشہ سائنسی علوم وفنون سے کافی دلچسپی رہی ہے۔

اُن کی یہ دیرینہ آرزو رہی ہے کہ طُلباء زیادہ سے زیادہ سائنسی تعلیم حاصل کریں تا کہ وہ جدید دنیا کے چلینجز کا مقابلہ کرسکیں۔وہ چاہتے تھے کہ سائنسی کُتب وجرائد کے زیادہ سے زیادہ تراجم ہُوں تا کہ سائنسی علوم سے ہر خاص و عام مستفید ہو جائے۔بابائے اردو مولوی عبدالحق کا بیان ہے کہ ۱۹۳۲ء میں علامہ اقبال نے اُن سے کہا کہ اردو کے لئے آپ کی کوششیں بڑی مبارک ہیں لیکن آپ کی توجہ صرف ادب پر ہے، ہونا یہ چاہئے کہ سائنس کی کتابیں اُردو میں منتقل ہُوں تا کہ مسلمان خیالی دنیا سے نکل کر عملی دنیا میں قدم رکھیں۔بابائے اردو نے جب اُن سے اس سلسلے میں کوئی کتاب تجویز فرمانے کو کہا تو انھوں نے جارج سارٹن کی "Introduction to the History of Science" کا نام لیا کیونکہ یہ کتاب نہ صرف سائنس کی تاریخ ہے بلکہ اس سے یہ بھی پتہ چلتا ہے کہ مسلمانوں نے سائنس کی ترقی میں کیسا نمایاں حصّہ لیا ہے۔۵

علامہ اقبال نے اپنے وسیع علمی وتاریخی مطالعے کے بعد یہی اخذ کیا کہ اسلامی نظام عمل ہی نے انسانی زندگی کے بنیادی مسائل حل کئے ہیں اوراس نظام میں وہ طبقاتی کشمکش اورآویزش کا کہیں شائبہ تک نظر نہیں آتا ہے جس نے ساری انسانیت کوآج ہنگاموں اور پریشانیوں کی آماجگاہ بنادیا ہے۔

اسی لئے وہ فرماتے ہیں۔

غبار آلودہ رنگ و نسب ہیں بال و پر تیرے
تو اے مُرغ حرم! اڑنے سے پہلے پر فشاں ہو جا ۶

اسی لئے آپ نے دنیا کے عصری خودساختہ نظام ہائے حیات پر تبصرہ کرتے ہوئے ایک خط میں آل احمد سرورؔ کو رقم کیا ہے کہ :

''میرے نزدیک فاشزم، کمیونزم یا زمانۂ حال کے اورازم کوئی حقیقت نہیں رکھتے۔میرے عقیدے کی رُو سے صرف اسلام ہی ایک حقیقت ہے جو بنی نوع انسان کے لئے ہر نقطہ نگاہ سے موجبِ نجات ہوسکتی ہے۔'' ۷

۱۷/اکتوبر ۱۹۲۶ء کوآپ خواجہ غلام السیّدین کے نام ایک مکتوب میں بڑی دردمندی کے ساتھ یوں اپنا اظہار

خیال کرتے ہیں:

''سوشلزم کے معترف ہر جگہ روحانیت اور مذہب کے خلاف ہیں اور اس کو افیون تصور کرتے ہیں۔ لفظ افیون اس ضمن میں سب سے پہلے کارل مارکس نے استعمال کیا تھا۔ میں مسلمان ہوں اور ان شاء اللہ مسلمان مروں گا۔ میرے نزدیک تاریک انسانی کی مادّی تعبیر سراسر غلط ہے۔ روحانیت کا میں قائل ہوں مگر روحانیت کے قرآنی مفہوم کا''۔۸

علامہ اقبال مادیّت کے بجائے ہمیشہ روحانیت (Spiritualism) پر زور دیتے آئے ہیں۔ اپنے انگریزی خطبات The Reconstruction of Religious Thought in Islam یعنی فکر اسلامی کی تشکیل جدید میں آپ نے عصر حاضر کی زبوں حال انسانیت کو تین ناگزیر ضرورتوں کا محتاج قرار دیتے ہوئے رقم کیا ہے کہ:

" Humanity needs three things today- a spiritual interpretation of the universe, spiritual emancipation of the individual, and basic principles of a universalimport directing teh evolution of human society on a spiritual basis." ۹

یعنی آج انسانیت کو تین چیزوں کی ضرورت ہے: کائنات کی ایک روحانی تعبیر، فرد کی روحانی نجات اور عالمگیر اہمیت کے بنیادی اصول جو روحانی بنیاد پر انسانی سماج کی ارتقا پذیری کی رہنمائی کر سکتے ہُوں۔ اور یہ فریضہ اقبال کے نزدیک دور حاضر میں مذہبی بنیادوں پر مبنی فرد اور معاشرہ ہی انجام دے سکتا ہے۔

مذکورہ خطبات میں اقبال اسلام کے حرکی نظام (Dynamic Islamic Way of Life) کی تشریح و توضیح کرتے ہوئے کہتے ہیں کہ ''اسلام میں انسانی اتحاد کی بنیاد مادّی نسلی اور جغرافیائی حدود کے بجائے روحانی ہے۔ اسلامی تہذیب ایک اللہ کے عقیدہ پر استوار ہے اور عقیدہ توحید تو پوری انسانیت کو اللہ کی غلامی میں لاتا ہے۔ یہی روحانی بنیاد بھی فراہم کرتا ہے۔۱۰

علامہ اقبال کے نزدیک ''اسلام میں روحانی اور مادی دو الگ عالم نہیں ہیں'' انسان کے ہر فعل یا عمل کا انحصار، خواہ وہ کتنا ہی دنیوی مفاد کو پیش نظر رکھ کر کیا جائے، کرنے والے کے ذہنی رجحان یا نیت پر ہے۔ یعنی انسان کا ذہنی پس منظر اس کے عمل کی نوعیت متعین کرتا ہے۔ اگر ذہن میں نیت کا فتور ہے تو عمل ''سیکولر'' یا ناپاک ہوگا۔ اگر ایسا

نہیں تو اسے ''روحانی'' (Spiritual) کہا جائے گا۔[۱۱]

گویا اسلام روح اور مادّے کی ثنویت کو نہیں مانتا ہے بلکہ غائر مطالعہ سے یہی حقیقت مترشح ہوتی ہے کہ ریاست یا مملکت اسلام کے مخصوص تصورات کی ترجمان ہوتی ہے۔علامہ اقبال اسی پس منظر میں توحید اور ریاست کے باہمی تعلق کے بارے میں اظہار خیال کرتے ہوئے کہتے ہیں:۔

"The essence of " Tawhid" as a working idea is equality, solidarity and freedom, The State, from the Islamic stand point, is an endeavour to transform their ideal principles into space-time forces, and aspiration to realize them in a definite human organisation."[۱۲]

درج بالا اقتباس سے یہی حقیقت مترشح ہوتی ہے کہ علامہ واضح کرتے ہیں کہ توحید کی اساس یہی تین اصول ہیں یعنی اتحادِ انسانیت، مساوات اور حریت۔

علامہ اقبال یہاں مسلمانوں کے اتحاد کے بجائے اتحاد انسانی پر زور دیتے ہیں۔اس کی وجہ یہ ہے کہ اُن کے یہاں مذہبی رواداری کا وسیع تصور ہے کیونکہ اُن کے نزدیک ''اسلامی نظام حکومت نہ جمہوریت ہے۔نہ ملوکیت ہے، نہ ارسٹوکریسی ہے اور نہ ہی تھیوکریسی ہے بلکہ ایک ایسا مرکب ہے جو ان تمام محاسن سے متصف اور قبائح سے منزہ ہے''۔ آپ کے نزدیک قرآن مسلمانوں پر یہ فرض عائد کرتا ہے کہ وہ دوسرے مذاہب کی عبادت گاہوں کا تحفظ کریں، یعنی قرآنی تعلیمات کے مطابق ضرورت پڑنے پر غیر مسلموں کی عبادت گاہوں کی حفاظت کرنا مسلمانوں کا فرض ہے۔غور طلب معاملہ یہ ہے کہ ایک ایسی ریاست جہاں مسلمانوں میں تو اشتراکِ ایمانی ہو اور غیر مسلم اقلیتوں کے ساتھ اشتراک وطنی کی بنیاد پر رشتہ استوار ہونا چاہئے۔لہٰذا اُن کے نزدیک اشتراکِ ایمانی اور اشتراکِ وطنی کی بنیاد پر ہی تو اتحاد انسانیت قائم ہوسکتی ہے۔علامہ تو یہاں تک کہتے ہیں کہ ''اسلام تو مجھ پر یہ فرض عائد کرتا ہے کہ میں غیر مسلموں کی عبادت گاہوں کی بھی حفاظت کروں''۔اس بارے میں ان کے اپنے الفاظ یوں ہیں:

" I entertain the highest respect for the customs, laws religious and social institutions of other comunities, Nay, it is my duty, according to teachings of the Quran, even, to defend of their places of worship, if need be ."[۱۳]

دراصل یہاں علامہ اقبال نے قرآن شریف کے سورہ الحج آیت نمبر ۴۰ سے استدلال کیا ہے جس میں اللہ

تعالیٰ ارشاد فرماتا ہے کہ ولولا دفع اللہ الناس بعضھم ببعض لھمت صوامع و بیع و صلوات و مسٰجد یذکر فیھا اسمہ کثیراً اگر اللہ لوگوں کو ایک دوسرے کے ذریعہ دفع نہ کرتا رہے تو خانقاہیں اور گرجا گر اور عبادت گاہیں جن میں اللہ کا کثرت سے نام لیا جاتا ہے، سب مسمار کر ڈالی جائیں''۔ ۱۴

آیت مذکورہ میں مساجد کی اصطلاح سب سے آخر میں آئی ہے۔ پہلے عیسائیوں کے کلیسا کا ذکر ہے۔ پھر یہود کے عبادت خانے کا ہے، خانقاہ کا ہے اور مسجد سب سے آخر میں آئی ہے۔ ریٹائرڈ جسٹس ڈاکٹر جاوید اقبال کے مطابق عام طور پر ابتدائی ایام کے فقہا اس آیت کی تعبیر اس طرح کرتے ہیں کہ اس میں صرف اہل کتاب ہی شامل ہیں جن کی حفاظت کرنا مسلم ریاست کا فرض ہے لیکن جب ایران فتح ہوا تو فقہاء نے پارسیوں یا زرتشتی مذاہب کے ماننے والوں کو بھی اس تحفظ میں شامل کیا اور ان کے عبادت خانوں کی حفاظت کی۔ ان کیلئے قرآنی اصطلاح وضع کی گئی ''کمثل اھل کتاب''۔ یہی صورت ہندوستان میں ہوئی۔ جس وقت ہندوستان پر مغل بادشاہوں کی حکومت تھی تو یہاں بھی بعض فقہاء نے ہندوؤں کو کمثل اھلِ کتاب کے زمرے میں شمال کر کے مسلم ریاست پر یہ فرض عائد کر دیا کہ وہ غیر مسلموں کا تحفظ کرے۔ ۱۵

علامہ اقبال کے خیال کے مطابق فکر حاضر نے اسلام اور دیگر مذاہب کی جو سب سے بڑی خدمت انجام ہے، وہ مادے پر اس کی تنقید ہے، جس سے ظاہر ہوتا ہے کہ مادے کی اپنی کوئی حیثیت نہیں جب تک ہم اس کی جڑیں روحانیت (Spiritualism) میں نہ ڈھونڈیں۔ اسی لئے علامہ اقبال کے نزدیک اس اعتبار سے کوئی چیز نہیں جسے ''ناپاک'' قرار دیا جائے۔ مادے کی تمام کثرت دراصل روح کے اپنے مسلسل اظہار ہی کا ذریعہ ہے۔ اس لئے سب کچھ ''مقدس'' (Sacred) ہے اس سلسلے میں علامہ اقبال خطبات میں یوں روشنی ڈالتے ہیں:۔

> ''اگر آپ کا مذہب کے بارے میں یہ خیال ہے کہ اس کا تعلق صرف آخرت سے ہے تو عیسائیت کا جو حشر یورپ میں ہوا ہے وہ بالکل قدرتی امر تھا۔ حضرت عیسیٰ علیہ السلام کے عالمگیر اخلاقی نظام کی جگہ جدید سیاسیات اور اخلاقیات کے قومی نظاموں نے لے لی۔ اس سے یورپ اس نتیجے پر پہنچنے کے لئے مجبور ہوا کہ مذہب فرد کا ذاتی معاملہ ہے اور اس کا دنیاوی زندگی سے کوئی تعلق نہیں ہے۔ اسلام انسان کی وحدت کو مادّے اور روح کی متضاد دوئی میں تقسیم نہیں کرتا۔ اسلام میں اللہ اور کائنات، روح اور مادّہ، کلیسا اور ریاست ایک کُل کے مختلف اجزاء ہیں۔ انسان کسی ناپاک دنیا

کا باشندہ نہیں ہے جسے وہ کسی ایسی دنیا کی خاطر ترک کرے جو کہیں اور واقع
ہے اسلام کے نزدیک مادہ روح کی وہ شکل ہے جو زمان و مکان میں ظہور
پذیر ہوتا ہے۔''

اقبالؒ یہاں دراصل رسولِ رحمت ﷺ کی بخاری شریف میں مذکور اُس حدیث مبارک کی روشنی میں اس دنیائے عالم کی نقاب کشائی کرتے ہیں جس میں آپ ﷺ فرماتے ہیں:

''جُعِلَت لِی الاَرضُ مسجد و طھوراً'' ۱۶ (میرے لئے تمام روئے زمین مسجد کی طرح پاکیزہ بنائی گئی ہے)

علامہ اقبال اسی حقیقت کی طرف توجہ دلاتے ہوئے جہاں پیشِ نظر خطبات میں رقم طراز ہیں کہ :

"There is no such thing as a profane world. All this immensity of matter constitutes as scope for the self realization of spirit. All is holy ground. As the Prophet Mohammad SAW so beautifully put it:. The world of this earth is a Mosque."۱۷

وہیں اپنے فارسی مجموعۂ کلام بعنوان ''پس چہ باید کرد اے اقوام شرق'' میں اپنے شعری پیرائے میں اس حدیث رسول رحمت ﷺ کو یوں پیش کرتے ہیں:

مومناں را گفت آں سلطانِ دینؐ
مسجدِ من ایں ہمہ روئے زمین
الاماں از گردشِ نُو آسمان
مسجدِ مؤمن بدستِ دیگراں
سخت کوشد بندۂ پاکیزہ کیش
تا بگیرد مسجدِ مولائے خویش ۱۸

ترجمہ:

۱۔ مومنوں کو اس سلطانِ دین یعنی حضور انور حضرت محمد ﷺ نے فرمایا ہے کہ یہ ساری زمین میری مسجد ہے یا میرے لئے مسجد یعنی پاکیزہ اور امن و امان کا گھر بنایا گیا ہے۔

۲۔ آسمانوں کی گردش سے اللہ ہمیں اپنے امن و امان میں رکھے۔ مومنوں کی یہ مسجد یعنی زمین آج غیروں اور غلط کاروں کے قبضہ میں آ گئی ہے۔

۳۔ پاکیزہ ملک کا متمنی یعنی مومنین یا اللہ کا بندہ اس سلسلے میں سخت کوشی کرتا ہے تا کہ اپنی جدو جہد سے وہ پھر اس زمین کو اللہ کی مسجد یعنی پاکیزہ اور امن وامان کی جگہ بنائے۔

اس لئے اقبال کے نزدیک توحید پر عمل پیرا ہونا عین فطرت انسانی ہے۔ لہٰذا اللہ سے وفاداری گویا انسان کی اپنی ہی مثالی فطرت سے وفاداری ہے۔ اسلام نے حقائق عظیمہ کے اس نصب العین پر مبنی جو معاشرہ تشکیل دیا ہے اس سے کاروبار زندگی میں لازماً دوام وتغیّر کے مطالبات کے درمیان ہم آہنگی پیدا ہوتی ہے اور دونوں کے تقاضے پورے ہوتے ہیں۔ اس میں اجتماعی زندگی کی ترغیب کے لئے ابدی اصول ہیں جو پیہم تغیّر پذیر کائنات میں قدم جمانے کے مواقع فراہم کرتے ہیں۔ لیکن جب یہی اصول تغیر کے تمام امکانات کو خارج کر دیں تو آیات الٰہی بھی جس کائنات کو متحرک قرار دیتی ہے وہ لازماً جمود سے ہمکنار ہو جاتی ہے، اسی لئے علامہ نے اس علمی تصور کو جہاں اپنے ان انگریزی خطبات میں واضح کرنے کی مدلّل کوشش کی ہے وہیں اُسے یوں شعری جامہ پہناتے ہوئے کہا ہے ؎

ٹھہرتا نہیں کاروانِ وجود کہ ہر لحظ ہے تازہ شان وجود
سمجھتا ہے تو راز ہے زندگی فقط ذوق پرواز ہے زندگی[۱۹]

یہ اشعار اقبال کے فلسفۂ حیات کو نہایت واضح کرتے ہیں۔ ان سے اچھی طرح سے یہ عیاں ہوتا ہے علامہ اقبال کے نزدیک زندگی ایک تسلسل کا نام ہے۔ اس کائنات میں تغیّر وتبدل ایک مستقل عمل ہے، اسی لئے اس متحرک کائنات کو دیکھ کر وہ بے اختیار پکار اٹھتے ہیں

سکون محال ہے قدرت کے کارخانے میں
ثبات ایک تغیّر کو ہے زمانے میں[۲۰]

سائنس کی رُو سے یہ مسلسل حرکت ہی اس نظام کائنات اور اس میں پائے جانے والے مادّی اجسام کی بقا کی ضامن ہے۔ غیر متحرک ہونے کی صورت میں سارے اجرام فلکی ایک دوسرے کو اپنی طرف کھینچ لیں گے اور اُن کے اس ٹکراؤ سے سارا نظام کائنات درہم برہم ہو جائے گا۔ علامہ کے نزدیک بھی سکون موت ہے اور مسلسل حرکت (dynamism) ہی زندگی کی ضامن ہے۔ اسی لئے وہ بانگِ درا کے ان اشعار میں یوں گویا ہوتے ہیں

چلنے والے نکل گئے ہیں!
جو ٹھہرے ذرا، کچل گئے ہیں[۲۱]

گویا اقبال کے نزدیک زندگی مسلسل چلنے کا نام ہے اُن کے یہاں اقوام کی موت وحیات کا انحصار حرکت اور جدو جہد

میں مضمر ہے، اسی لئے وہ اسرارِ خودی میں بھی رطب اللّسان ہیں۔

زندگانی از خرامِ پیہم است
برگ و سازِ ہستی موجِ از رم است۲۲

(زندگی لگاتار چلنے کا نام ہے موجوں کی زندگی کا ساز وساماں دوڑنے بھاگنے سے ہے)

سائنسی تحقیقات ثابت کرتی ہیں کہ اس کرۂ ارض پر بقاحیات کا انحصار سورج پر ہے۔ اس سارے نظام میں، جس کا زمین ایک چھوٹا حصہ ہے، آفتاب کو مرکزی حیثیت حاصل ہے۔ اسی لئے اسے نظام شمسی کہا جاتا ہے۔ آج اگر یہ آفتاب عالم تاب بُجھ جائے تو زمین پر توانائی کے سارے سوتے خشک ہوجائیں گے اور زندگی باقی ہی نہ رہ سکے گی علامہ اقبال اس آفاقی حقیقت کا اعتراف بانگ درا میں ''آفتاب'' کے عنوان سے یوں کرتے ہیں ؎

اے آفتابِ روح روانِ جہاں ہے تُو
شیرازہ بند دفتر کون ومکاں ہے تُو۲۳

خذُ ما صفا ودع ما کدر کے مطابق علامہ اقبال اس نظم کے سلسلے میں ۱۹۰۲ء میں اپنے تاثرات بیان کرتے ہوئے ''رگِ وید'' کا حوالہ دیتے ہوئے اس کی معنویت کو یُوں اُجاگر کرتے ہیں۔

''ذیل کے اشعار ''رگِ وید'' کی نہایت قدیم اور مشہور دُعا کا ترجمہ ہے جس کو ''گا تیری'' کہتے ہیں۔ یہ دُعا عبدیت کی صورت میں ان تاثرات کا اظہار ہے جنھوں نے نظام عالم کے حیرتناک مظاہر کے مشاہدے سے اوّل اوّل انسان ضعیف البنیان کے دل میں ہجوم کیا ہوگا۔ اس قسم کی قدیم تحریروں کا مطالعہ علم ملل والنحل کے عالموں کے لئے انتہائی ضروری ہے کیونکہ ان سے انسان کے روحانی نمو کے ابتدائی مراحل کا پتا چلتا ہے۔ یہی وہ دُعا ہے جو چاروں ویدوں میں مشترک پائی جاتی ہے اور جس کو برہمن اس قدر مقدس سمجھتا ہے کہ بے طہارت اور کسی کے سامنے اس کو پڑھتا تک نہیں۔ جو لوگ السنہ شرقیہ کی تصانیف سے واقف ہیں اُن کو معلوم ہے کہ آنجہانی سر ولیم جونس کو اس دُعا کے معلوم کرنے میں کس قدر تکلیف اور محنت برداشت کرنا پڑی تھی۔ مغربی زبانوں میں اس کے بہت سے ترجمے کئے گئے ہیں لیکن حق یہ ہے کہ زبان سنسکرت کی نحوی پیچیدگیوں کی وجہ سے اس حال میں وضاحت کے ساتھ اس کا مفہوم ادا کرنا نہایت مشکل ہے۔ اس مقام پر یہ ظاہر کردینا بھی ضروری معلوم ہوتا ہے کہ اصل سنسکرت میں لفظ ''سوتر'' استعمال کیا گیا ہے جس کے لئے اردو لفظ نہ مل سکنے کے باعث ہم نے لفظ آفتاب رکھا ہے۔ لیکن اصل میں اس لفظ سے مراد اُس آفتاب سے ہے جو فوق المحسوسات ہے اور جس سے یہ مادی آفتاب کسب ضیا کرتا ہے۔ اکثر قدیم قوموں نیز صوفیاء نے اللہ کی ہستی کو نُور سے تعبیر کیا ہے۔ قرآن پاک میں آیا ہے اللہ نُور السموات والارض اور شیخ محی الدین ابن عربی

فرماتے ہیں اللہ ایک نُور ہے جس سے تمام چیزیں نظر آتی ہیں، لیکن وہ خود نظر نہیں آتا۔ علی ہذا القیاس افلاطون الٰہی کے مصری پیروؤں اور ایران کے قدیم انبیاء کا بھی یہی مذہب تھا۔۲۴

عہد حاضر کے سائنس دان مشاہدات سے اس بات کو ثابت کر چکے ہیں کہ چاند ایک تاریک دنیا ہے۔ وہ ایک بے نُور سیّارچہ ہے اور زمین کے گرد حرکت کرنے پر مجبور ہے۔ علامہ اقبال نے اسرارِ خودی'' میں اس حقیقت کی پردہ کشائی کرتے ہوئے کہا ہے کہ زمین نے اپنی خودی مضبوط رکھی تو چاند زمین کے اردگرد چکّر لگانے کا پابند ہو گیا ؎

چوں زمیں بر ہستیٔ خود محکم است
ماہ پابند طواف پیہم است۲۵

آگے چل کر کہتے ہیں کہ چاند کو سورج کے دسترخوان سے روزی ملتی ہے، اسی لئے چاند کے دل پر سورج کے احسان کا داغ لگا ہوا ہے

ماہ را روزی رسا از خوانِ مہر
داغ بردل دارد از احسانِ مہر۲۶

''بانگِ درا'' میں آپ نے اسی سائنسی تصور کو یوں پیش کیا ہے

مہر نے نور کا زیور تجھے پہنایا ہے
تری محفل کو اسی شمع نے چمکایا ہے۲۷

بانگِ درا (انسان اور بزم قدرت)

''محمد اعجاز الحق کے مطابق'' اقبال علم فلکیات Science of Astronomy میں خصوصی دلچسپی رکھتے تھے۔ آپ کی شاعری میں اجرام فلکی کا ذکر خاص طور پر ہوا ہے، جن کا استعمال اگرچہ انھوں نے اپنے فلسفیانہ تصورات کی توضیح وتشریح کیلئے کیا ہے اور یہ اُن کی شعری جمالیات سے وابستہ ہیں مگر ان میں سائنسی رمزیت بھی پائی جاتی ہے۔''۲۸

علم فلکیات کی رُو سے صرف یہی ایک جہاں نہیں جو ہمارے پیش نظر ہے بلکہ بہت سے ایسے جہاں ہیں جو فی الوقت ہماری نظروں سے پوشیدہ ہیں اور عین ممکن ہے کہ وقت گذرنے کے ساتھ ساتھ ہم انھیں جان سکیں بلکہ ابھی سینکڑوں کہکشاں ہیں جو ہماری نظروں سے اوجھل ہیں۔ سائنس دان ابھی تک کائنات کے صرف چار فی صد حصے تک ہی اپنی نظریں انتہائی طاقتور دوربینوں کے باوجود دوڑا پائے ہیں اور وہ باقی ۹۶ فی صد کائنات کے متعلق کچھ نہیں

جانتے۔

اس سلسلے میں قرآن حکیم میں بڑے واضح اشارے ملتے ہیں کہ ہماری زمین کے علاوہ بھی آسمانوں میں ایسی جگہیں موجود ہیں جہاں جاندار مخلوقات پائی جاتی ہیں۔ چنانچہ قرآن کریم میں مذکور ہے کہ (ترجمہ) زمین اور آسمانوں میں جس قدر جاندار مخلوقات ہیں جتنے مالائکہ ہیں، سب اللہ کے آگے سربسجود ہیں اور ہرگز سرکشی نہیں کرتے۔''۲۹

دوسری جگہ ارشاد ربانی ہے کہ (ترجمہ) اُس کی نشانیوں میں سے ہے کہ زمین اور آسمانوں کی پیدائش اور یہ جاندار مخلوقات جو اُس نے دونوں جگہ پھیلا رکھی ہیں، وہ سب جب چاہے انھیں اکٹھا کرسکتا ہے''۔۳۰

اس طرح سے مذکورہ بالا قرآنی آئیوں کے مطابق زمین اور آسمانوں میں بھی ایسی بہت ساری جگہیں ہیں جہاں اللہ نے فرشتوں کے علاوہ اور بھی جاندار مخلوقات رکھی ہیں۔

غالبًا علامہ اقبال نے اسی لئے بال جبرئیل میں بھی کہا ہے۔

اسی روز و شب میں الجھ کر نہ رہ جا
کہ تیرے زمان و مکان اور بھی ہیں ۳۱

دوسری جگہ کہا ہے کہ

کھو نہ جا اس سحر و شام میں اے صاحب ہوش
اک جہاں اور بھی ہے جس میں نہ فردا ہے نہ دوش ۳۲

تخلیق کائنات کا نظریہ سائینس میں ہمیشہ باقی رہے گا کیونکہ یہ قرآن پاک سے مکمل مطابقت رکھتا ہے۔ اسی طرح قرآن حکیم اس بات کی بھی مکمل تائید کرتا ہے کہ یہ کائنات جامد و ساکن (Stagnant) نہیں ہے بلکہ یہ متحرک dynamic اور توسیع پذیر کائنات ہے اور اس میں ہر آن تخلیقی عمل جاری ہے۔ کل یوم ھو فی شان (الرحمٰن) یعنی اللہ ہر وقت نئی شان کے ساتھ جلوہ گر ہوتا ہے اسی لئے اقبال مؤمن کے متعلق بھی کہتے ہیں

ہر لحظ ہے مومن کی نئی شان نئی آن
گفتار میں کردار میں اللہ کی برہان ۳۳

دوسری جگہ قرآن میں فرمایا گیا ہے کہ: والسّماء بنینٰھا بایدو نا الموسعون۔ (51:47)

(ترجمہ) آسمان اور باقی کائنات کو ہم نے قوت سے بنایا اور اسے پھیلانے والے ہم ہی ہیں۔ مفسّرین قرآن کے مطابق موسع کے معنی طاقت و مقدرت رکھنے والے کے بھی ہو سکتے ہیں۔ اس آیت کا مطلب یہ ہے کہ اس عظیم کائنات کو اللہ ایک دفعہ بنا کر نہیں رہ گئے بلکہ وہ مسلسل اس میں توسیع کر رہے ہیں اور ہر آن ہماری تخلیق کے نئے نئے

کر شمے رونما ہو رہے ہیں۔'' اسی لئے قرآن میں اللہ فرماتا ہے کہ:'' یزید فی الخلق ما یشاء ان اللہ علیٰ کل شئی قدیر'' (35:1) (ترجمہ) ہم تخلیق میں اضافہ کرتے رہتے ہیں جیسا ہم چاہتے ہیں یقیناً اللہ ہر چیز پر قادر ہے۔ ان آیات بینات کی روشنی ہی میں تو اقبال خطبات کے علاوہ بال جبرئیل کے اس شعر میں کہتے ہیں

یہ کائنات ابھی ناتمام ہے شاید
کہ آرہی ہے دما دم صدائے کن فیکون ۳۴

عصر حاضر میں مسئلہ زمان ومکان کے حوالے سے اقبال کے تصور معراج سے کافی حد تک اخذ وفیض کیا جاسکتا ہے کیونکہ معراج انسانی ہمت، صلاحیت اور اللہ کی رحمت کا اس دنیا میں سب سے بڑا کارنامہ ہے۔ مسلمان کے لئے اس میں یہی سبق ہے کہ انسان کے عزم وہمت کی آخری منزل عرش بریں ہے ۔

اختر شام کی آتی ہے فلک سے آواز
سجدہ کرتی ہے سحر جس کو وہ ہے آج کی رات
رہ یک گام ہے ہمت کے لئے عرش بریں
کہہ رہی ہے یہ مسلمان سے معراج کی رات ۳۵

انسان کامل کی خودی جب اپنی وجدانی قوت کے بل پر زمان ومکان کی تسخیر کرتی ہے تو وہی معراج ہے۔ اس دور میں جب خلائی تسخیر ممکن ہوگئی ہے۔ واقعہ معراج کی مادی تعبیر میں اب کسی کلام کی گنجائش نہیں رہی۔ اب بشر کے لئے یہ ممکن ہوگیا ہے کہ وہ افلاک کی تسخیر کر سکے۔ علامہ اقبال نے روحانی، فکری اور سائنسی حوالے سے ہی تو کہا ہے کہ

سبق ملا ہے یہ معراج مصطفویؐ سے مجھے
کہ عالم بشیریت کی زد میں ہے گردوں

حواشی حوالہ جات

1۔کلیات اقبال اردو (ضربِ کلیم) کتابی دنیا دہلی، ۲۰۰۴ء، ص۔657

2۔ کلیات اقبال اردو (بال جبرئیل) کتابی دنیا دہلی، ۲۰۰۴ء، ص۔494

3۔کلیات اقبال اردو (بانگِ درا، نظم مسلم) کتابی دنیا دہلی، ۲۰۰۴ء، ص۔275

4۔کلیات اقبال اردو (بال جبرئیل) کتابی دنیا دہلی، ۲۰۰۴ء، ص۔585

5۔محمد اعجاز الحق، اقبال اور سائنسی تصورات، دارالنوا اور اردو بازار، لاہور ۲۰۱۴ء ص۔12-13

6۔کلیات اقبال (اردو) بانگ درا نظم، طلوع اسلام، ص۔387

7۔ شیخ عطا اللہ (مسلم یونیورسٹی علی گڈھ) اقبال نامہ مجموعہ مکاتیب اقبال، اقبال اکادمی پاکستان، ۲۰۱۲ء، ص۔580

8۔شیخ عطااللہ (مسلم یونیورسٹی علی گڈھ) اقبال نامہ مجموعہ مکاتیب اقبال، اقبال اکادمی پاکستان، ۲۰۱۲ء، ص243

9۔خطبات اقبال (انگریزی) کتاب باؤن نئی دہلی، جدید اڈیشن ۲۰۱۲ء، ص179

10۔خطبات اقبال (انگریزی) کتاب باؤن نئی دہلی، جدید اڈیشن ۲۰۱۲ء، ص۔180

11۔ڈاکٹر جاوید اقبال ''خطبات اقبال-تسہیل و تفہیم'' سنگ میل پبلی کیشنز، لاہور، ۲۰۰۸ء، ص۔184

12۔خطبات اقبال، (انگریزی)، ص۔154

13۔علامہ اقبال کی تقاریر، تحریرات اور بیانات (انگریزی) مرتبہ لطیف احمد شیروانی، اقبال اکادمی، ۲۰۰۵ء، ص۔9

14۔القرآن، سورۃ الحج، آیت نمبر ۴۰۔

15۔ڈاکٹر جاوید اقبال ''اقبال اور اسلامی ریاست'' (مشمولہ اقبال-فکر اسلامی کی تشکیل جدید، مرتبہ سید حسین محمد جعفری) اسلامک بک فاونڈیشن، دہلی، ۱۹۹۵ء، ص۔101

16۔رواہ البخاری، باب التیمم، حدیث نمبر 224

17۔خطباتِ اقبال (انگریزی)، ص۔155

18۔کلیات اقبال (فارسی) ص۔817

19۔کلیاتِ اقبال (اردو) (بال جبرئیل نظم ساقی نامہ) ص۔577

20۔ کلیاتِ اقبال (اردو) (بانگ درا نظم ستارا) ص۔209

21۔کلیاتِ اقبال (اردو) (نظم چاند اور تارے) ص۔170

22۔کلیات اقبال (فارسی) اسرار خودی حکایت شیخ و برہمن، ص۔ 60
23۔کلیاتِ اقبال (اردو) بانگ درا نظم آفتاب، ص۔62
24۔ڈاکٹر عبدالمجید، ڈاکٹر شفیق احمد ''اقبال اور جدید سائنسی نظریات (مشمولہ) بزم اقبال، کلب روڈ، لاہور ۱۹۹۹ء
ص۔13-14
25۔کلیاتِ اقبال (فارسی)، اِسرار خودی در بیان ایں کہ اصل نظام عالم، ص۔15
26۔کلیاتِ اقبال فارسی (اِسرار خودی) در بیان ایں کہ خودی از سوال، ص۔24
27۔کلیات اقبال (اردو) بانگ درا، نظم انسان اور بزم قدرت، ص۔77
28۔محمد اعجاز الحق ''اقبال اور سائنسی تصورات'' ص۔50
29۔القُرآن۔16-49
30۔القُرآن۔29-42
31۔کلیاتِ اقبال (اردو) بالِ جبرئیل غزل ستاروں۔۔۔۔۔۔ص۔497
32۔ کلیاتِ اقبال (اردو) بالِ جبرئیل، ص۔514
33۔کلیاتِ اقبال (اردو) بالِ جبرئیل، ص۔697
34۔کلیاتِ اقبال (اردو) بالِ جبرئیل، ص۔454
35۔ کلیاتِ اقبال (اردو) بانگِ درا، نظم شب معراج، ضربِ کلیم، ص۔354
36۔کلیات اقبال (اردو) غزل بال جبرئیل، ص454

✿✿✿

ڈاکٹر رؤف خیر

اقبال حق وناحق کے درمیان اقبال

سرگودھا پاکستان سے تقریباً ایک ہزار صفحات پر مشتمل ایک ضخیم کتاب ''چند ہم عصر اقبال شناس'' 2018 میں شائع ہوئی جس میں جملہ ایک سو پانچ ہم عصر اقبال شناسوں کا اقبال سے متعلق خدمات کے حوالے سے مکمل تعارف دیا گیا ہے۔ان میں ستانوے (97) لکھنے والے تو پاکستان کے ہیں باقی صرف آٹھ ہیں جن کا تعلق بھارت سے ہے۔ان آٹھ بھارتی قلم کاروں میں ناچیز رؤف خیر کا ''اقبال بہ چشم خیر'' کے حوالے سے تفصیلی ذکر بھی ہے۔اسی کتاب میں پروفیسر عبدالحق جیسے ماہر اقبالیات پر مؤلفِ کتاب ڈاکٹر ہارون الرشید تبسم نے کھل کر لکھا ہے۔

پروفیسر عبدالحق کی کتابوں کی جائزہ پیش کرتے ہوئے ڈاکٹر ہارون الرشید تبسم نے پروفیسر صاحب کا جامع تعارف پیش کیا ہے۔سب سے پہلے بھارت میں علامہ اقبال کے فکر وفن کے حوالے سے'' اقبالیات کا تنقیدی جائزہ'' پیش کر کے جناب عبدالحق نے پی۔ایچ ڈی کی ڈگری حاصل کی۔

اردو فارسی عربی میں نایاب علمی ادبی، ذخائر مخطوطات کی شکل میں پائے جاتے ہیں ان کی قرأت بجائے خود دیدہ ریزی کا کام ہے۔پروفیسر عبدالحق نے باضابطہ مخطوط شناسی میں 1967 میں ڈپلوما حاصل کیا جو لیکچرر کی حیثیت سے ان کے تقرر میں ممد ومعاون ثابت ہوا کہ اس طرح کی اضافی سند دیگر امیدواروں کے پاس نہیں تھی۔ 1972 میں علی گڑھ یونیورسٹی سے فارسی میں ایم۔اے کیا۔گورکھپور یونیورسٹی سے اردو میں ایم۔اے کیا اور پھر پی۔ ایچ ڈی بھی اردو میں گورکھپور یونیورسٹی ہی سے کیا پروفیسر محمود الٰہی جہاں اردو کے شعبے میں ذمہ دار تھے۔دہلی یونیورسٹی میں پروفیسر عبدالحق کا تقرر 1968 میں بحیثیت لیکچرر ہوا۔وہ ترقی کر کے ریڈر ہوئے پھر پروفیسر بھی ہو گئے۔

1980 میں بھارت کے اساتذہ پر مشتمل ایک وفد کے ساتھ پروفیسر عبدالحق بھی پاکستان کے دورے پر گئے جہاں لاہور، اسلام آباد، کوئٹہ، پشاور اور کراچی کی جامعات کو قریب سے دیکھنے کا موقع ملا۔10 نومبر 1980 کو صدر جنرل ضیاء الحق نے ایوانِ صدر میں وفد کو پُر تکلف عشائیہ دیا۔پروفیسر عبدالحق نے 1984 میں لیبیا کا چودہ روزہ دورہ کیا جہاں کرنل قدافی سے بھی تبادلۂ خیال کیا اور ماریشس بھی کئی دورے کیے۔اس طرح پوری ادبی دنیا میں

پروفیسر عبدالحق کی پذیرائی ہوتی رہی ہے (بحوالہ: چند ہم عصر اقبال شناس، سرگودھا پاکستان مؤلف ہارون الرشید تبسم)

علامہ اقبال سے پروفیسر عبدالحق کو بڑی عقیدت ہے۔ وہ بلا شبہ ماہر اقبالیات ہیں۔ سب سے پہلے ہمیں حیدرآباد میں ان کا نیاز اس وقت حاصل ہوا۔ جب اقبال اکادمی نے عالمی اقبال کانفرنس 1986 میں منعقد کی تھی جس میں دنیا بھر سے ماہرینِ اقبالیات کو مدعو کیا تھا۔ ہندوستانی ماہرین اقبالیات میں جگن ناتھ آزاد، آل احمد سرور، شمس الرحمٰن فاروقی، علی سردار جعفری تھے (جہاں وہ ناخوش گوار واقعہ بھی ہوا تھا کہ جب علی سردار جعفری تقریر کے لیے اٹھے تو دو نوجوان نے انھیں جوتوں کا ہار پہنا کر موٹر سائیکل پر فرار ہو گئے۔ معلوم ہوا کہ انھوں نے کہیں اسلام یا مسلمانوں کے خلاف بیان دیا تھا۔ لیکن علی سردار جعفری نے بڑے صبر کا مظاہرہ کیا اور اقبال سے متعلق تقریر کی اسی دن دوپہر 6 اپریل 1986 کو جاوید میاں داد نے تاریخی چھکا مار کر اپنی ٹیم کو کامیابی دلائی تھی) جناب مضطر مجاز نے روزنامہ مصنف میں ''میں بھی حاضر تھا وہاں'' کے عنوان سے اور ناچیز رؤف خیر نے روزنامہ رہنمائے دکن میں دو قسطوں میں پوری رپورتاژ لکھی تھی۔ تفصیلات کے لیے اپریل 1986 کے تینوں اخبارات ملاحظہ کیے جاسکتے ہیں۔ اب یہ یاد نہیں آرہا ہے کہ پروفیسر عبدالحق نے اس کانفرنس میں اقبال کے کس پہلو پر اپنا مقالہ پیش کیا تھا۔ پاکستان سے اس عالمی اقبال کانفرنس میں ڈاکٹر رفیع الدین ہاشمی، ڈاکٹر تحسین فراقی، آصف فرخی، وغیرہ نے شرکت کی تھی اور معلوماتی مقالے پیش کیے تھے۔

پروفیسر عبدالحق کی پہلی کاوش ''اقبال کے ابتدائی افکار'' 1969 میں شائع ہوئی جو ان کے پی۔ ایچ ڈی کے مقالہ کا ایک باب ہے جو اقبال اور اقبالیات سے متعلق تھا۔ ڈاکٹر ہارون الرشید تبسم نے یہ انکشاف بھی کیا کہ اس مقالے پر مقالہ نگار کا نام ''عبدالحق صدیقی'' درج ہے۔ اقبال کے ابتدائی افکار میں عبدالحق صاحب نے اقبال کے فکر و فن کے تین ابواب مقرر کیے ہیں۔

پروفیسر عبدالحق کی ایک اور کتاب ''تنقید اقبال اور دوسرے مضامین'' بھی۔ 1976 میں منظر عام پر آئی جس میں مطالعۂ اقبال کے چند اساسی پہلو اقبال کی فکری سرگذشت، خطوطِ اقبال اور اقبال اپنے معاصرین کی نظر میں جیسے عنوانات کے تحت اقبال کے فکر و فن کا جائزہ لیا گیا ہے۔ 1997 میں پروفیسر عبدالحق نے طلبہ و طالبات کی سہولت کی خاطر ایک عصری لغت بھی ترتیب دی ہے۔

پروفیسر عبدالحق نے 1989 میں فکر اقبال کی سرگذشت شائع کی جس میں اقبال کے شعری آہنگ، شارحین اقبال اور فیض تصورِ بشر اور اقبال کا مردِ مومن جیسے موضوعات پر خامہ فرسائی کی گئی ہے۔

پروفیسر عبدالحق کی ایک اور مرتبہ کتاب ''اقبال کی شعری و فکری جہات'' 1998 میں دہلی سے شائع کی جس میں بعض ماہرینِ اقبالیات کے مضامین جمع کر دیئے گئے ہیں۔

1989 میں پروفیسر عبدالحق کی ایک مرتبہ کتاب ''اقبال کے شعری اسالیب'' شائع ہوئی جس میں بعض اہم ماہرینِ اقبالیات کے مضامین شامل کیے گئے ہیں: اقبال پر ان کی کتاب اقبال اور اقبالیات 2006 میں شائع ہوئی دوسرے ہی سال اس کا دوسرا ایڈیشن کشمیر سے شائع ہوا متاعِ سخن 1977 میں شائع ہوا۔ یہ اردو شاعری کا ایک مفید اور منفرد انتخاب ہے۔ اس کا دوسرا ایڈیشن اردو کونسل نے شائع کیا۔ ان کی ایک بہت ہی کارآمد اور نصابی ضرورتوں کی کفالت کرنے والی کتاب عصری لغت ہے۔ جس کے اب تک چار ایڈیشن منظر عام پر آ چکے ہیں۔ اردو کونسل نے بڑے اہتمام سے شائع کیا ہے۔ عام کتابی سائز میں استعمال عام کے لیے بہت کارآمد ہے۔ خاص طور پر طلباء کے لیے ۔ان کے تراجم بھی قابل قدر ہیں جیسے عصری ملیالم کہانیاں، غدر 1857، فضائل ذکر، بکھرے خیالات، لال بہادر شاستری۔ پروفیسر موصوف نے اب تک پانچ مونوگراف لکھ کر ایک مثال قائم کی ہے۔ علامہ اقبال پر تین، شاہ حاتم اور ولی دکنی پر سرکاری اداروں نے شائع کیے ہیں۔ گویا ان کا قلم تیز جولاں ہے اور زود رس بھی۔

مغربی بنگال اردو اکادمی کلکتہ کی فرمائش پر عبدالحق صاحب نے ایک مونوگراف ''محمد اقبال'' ترتیب دیا ہے۔ نیشنل بک ٹرسٹ اور دہلی اردو اکیڈمی کے بعد اقبال پر یہ ان کا تیسرا مونوگراف ہے۔ علامہ پر سب سے زیادہ لکھنے والے عبدالحق ہیں ان کی سولہ کتابیں صرف علامہ سے متعلق ہیں باقی چالیس کتابیں دوسرے موضوعات پر ہیں۔ اقبال پر درجن سے زائد کتابوں کے علاوہ عبدالحق کا بڑا کام کلاسیکی ادب کے اہم متون کی تدوین ہے۔ ''دیوانِ حاتم'' کے نایاب قدیم دیوان کی تلاش و تدوین ادبی تاریخ میں ایک یادگار رہے۔ دیوان زادہ کو سات قلمی نسخوں کی مدد سے مرتب کیا جانا بھی ایک بڑا کام ہے۔ قطبی کے تیرہ ماسہ کے نایاب ترین نسخہ کی تحقیق اور اشاعت ہماری تخلیقی تاریخ میں ایک گراں قدر اضافہ ہے یہ بارہ ماسہ کی روایت میں ایک تاریخ ہے اس کا ہندی ترجمہ بھی شائع ہوا ہے۔ پھر دلی کے کلیات کو متعدد خطی نسخوں کی مدد سے مرتب کیا جانا ایک اور قابل ذکر خدمت ہے جو پروفیسر موصوف کی تحقیقی سرگرمیوں کا حامل ہے ان سب کے ساتھ ایک اور کام بہت ہی قابل ذکر ہے کہ انہوں نے دیوانِ غالب کے اہم ترین ایک نایاب قلمی نسخہ کو شائع (2021) کر کے غالبیات میں ناقابل فراموش کارانجام دیا ہے۔ جسے موجودہ صدی کی اہم دریافت کہہ سکتے ہیں۔ ان کے علاوہ فارسی کا بہت اہم تذکرہ بھی ہے جو تذکرۂ الٰہی کے نام سے تین جلدوں میں شائع ہوا ہے یہ دنیا کا واحد قلمی نسخہ ہے جو موصوف نے حاصل کیا اور بڑے اہتمام سے حکومتِ ہند نے 2013 میں شائع کیا ہے۔ انہوں نے اب تک خسرو، بیدل، شاہی سبزواری، آصفی وغیرہ کے دواوین کے اہم مخطوطات کا تعارف بھی کرایا ہے۔ اساتذہ کی صنف میں یہ ان کا خاص امتیاز ہے کہ انہوں نے فارسی شعرا پر بہت کچھ قلم بند کیا ہے۔ ان کے تحقیقی اور تدوینی کام پر اسلام آباد کی یونی ورسٹی نے ڈاکٹر عامر محمود کو ڈاکٹریٹ کی ڈگری دی ہے وہ کتاب شائع ہو چکی ہے۔

ڈاکٹر ہارون الرشید تبسم نے پروفیسر عبدالحق کی دستیاب کتابوں کا اجمالی تعارف اپنی معرکہ آرا کتاب ''چند ہم عصر اقبال شناس'' میں ضرور کیا ہے مگر ان کے ایک اہم کارنامے کا ذکر اس کتاب میں آنے سے رہ گیا۔ وہ یہ کہ پروفیسر عبدالحق نے علامہ اقبال کی ڈائری میں لکھے انگریزی نوٹس STRAY REFLECTIONS کا اردو ترجمہ ''بکھرے خیالات'' کے نام سے کیا جو کتابی شکل میں 1975ء میں دہلی سے منظر عام پر آیا۔ اس کے اب تک تین ایڈیشن آ چکے ہیں۔

پروفیسر عبدالحق جب پاکستان کے دورے پر گئے تھے اور مختلف جامعات کی زیارت کر رہے تھے تو ڈاکٹر محمد ایوب لِلّہ نے پروفیسر عبدالحق سے ایک مصاحبہ کیا جس میں پروفیسر صاحب نے اپنے بارے میں کافی تفصیلات بیان کیں جیسے جب وہ ''اقبالیات کا تنقیدی مطالعہ'' پر پی۔ ایچ ڈی کر رہے تھے تو بعض عناصر کو پسند نہیں تھا کہ اقبال پر کام کرنے والوں کو ڈگری دی جائے۔ پروفیسر عبدالحق کی دلچسپی کے موضوعات ہیں:

> ''اقبال، غالب، شبلی اور رشید احمد صدیقی۔ فکر اقبال کی ترویج کو وہ اپنے فرائض میں شمار کرتے ہیں۔ انھوں نے اقبالیات کے تعلق سے فرمایا کہ اقبالیات کے موضوعات مختلف اور وسیع تر ہیں جن کی جہات کے بہت سے رُخ ہیں۔ صرف اقبال کی شاعری اور ان کے فلسفیانہ نظام پر کام کرنا کافی نہیں ہے۔ ان کے عہد، ان کے معاشرے اور طرزِ احساس کے ساتھ ساتھ اس وقت کے متداول علوم کے سرچشمے ان جہات کے گونا گوں اسالیب سے مربوط ہیں لہٰذا اقبال کے عمرانی، ثقافتی، فکری، روحانی، سائنسی، معاشیاتی، تمدنی اور سیاسی نظریات کے ساتھ ساتھ اقبال کی اجتہادی فکر اور ان کے تخلیقی فن کے بے شمار امتیازات کو بھی منظر عام پر لانے کی ضرورت ہے...''

(بحوالہ: چند ہم عصر اقبال شناس۔ سرگودھا پاکستان مرتبہ ڈاکٹر ہارون الرشید تبسم، سن اشاعت 2018)

علامہ اقبال سے پروفیسر عبدالحق کے تعلقِ خاطر کا یہ عالم ہے کہ انھوں نے صاف صاف فرمایا:

> ''ہماری صفوں میں وہی دانش وری کا مستحق ہے جس کو اقبال اور اقبالیات سے شغف ہے۔ سو سال کی ادبی اور علمی تاریخ نے یہ ثابت کر دیا ہے کہ اقبال کے بغیر دعوائے دانش وری ایک فعلِ عبث ہے۔''

پروفیسر عبدالحق نے ایک سوال کے جواب میں فرمایا:

> ''دنیا کی تاریخ میں فلسفہ اور شاعری کبھی یوں ہم آمیز نہیں ہوئے جیسے اقبال کے ہاں نظر

آتے ہیں ....اقبال کی شاعری وجدان نہیں الہام ہے اور میں یہ کہتا ہوں کہ مسلم گھروں میں قرآن اور احادیثِ نبوی کے ساتھ اگر کلام اقبال بھی پڑھنے کا اہتمام کیا جائے تو شاید ہماری تاریخ بدل جائے ....اقبال کا فلسفۂ خودی غلام سماج کے لیے ایک روحانی طاقت ہے۔''

(بحوالہ: چند ہم عصر اقبال شناس۔ پاکستان)

پروفیسر عبدالحق نے اردو کے مستقبل کے تعلق سے خوش گمانیوں کا اظہار بھی کیا اور بتایا کہ ہندوستان کی تہتّر 73 مختلف یونی ورسٹیوں میں اردو کے نصابات مختلف سطح پر پڑھائے جا رہے ہیں۔

پروفیسر عبدالحق کے بارے میں ایک پوری کتاب ''سوز و گداز زندگی'' 2019 میں شائع ہوتی جس میں کئی مشاہیر ادب نے پروفیسر عبدالحق کی زندگی کے مختلف مرحلوں کا جائزہ لیا۔ ان کی کتابوں کی روشنی میں ان کے فکر و فن پر روشنی ڈالی۔ خاص طور پر ڈاکٹر محمود حسن الہ آبادی نے پروفیسر عبدالحق کی کتاب ''اقبال کا حرفِ شیریں'' پر تفصیل سے لکھا ہے جس میں مختلف عنوانات کے تحت حق صاحب نے معلومات کے دریا بہائے ہیں اور اقبال کی شعر گوئی کی خصوصیات پر جامع مقالہ لکھا ہے جیسے قافیہ و ردیف کی ندرت، الفاظ کے تکرار کا حُسن، بحروں کا تنوع، مذہبی تلمیحات و استعارات جیسے جبریل ابلیس، ابراہیم، نمرود فرعون موسیٰ وغیرہ۔ اس طرح اقبال نے ایک نئے دبستانِ فکر کی بنیاد ڈالی۔

پروفیسر عبدالحق کو شارحینِ اقبال سے گلہ ہے کہ انھوں نے تشریح و شرح کا حق ادا نہیں کیا خاص طور پر یوسف سلیم چشتی کو وہ شارحِ اقبال کی حیثیت سے معتبر نہیں سمجھتے۔ حافظ ملک صاحب کی کتاب ''اقبال: پاکستان کا ایک شاعر فلسفی'' دراصل انگریزی میں لکھی ہوئی ایسی کتاب ہے جس میں سترہ مقالہ نگاروں کے مقالے جمع کر دیئے گئے ہیں ۔ پروفیسر عبدالحق اقبال کو بین الاقوامی شاعر تسلیم کرتے ہیں۔

(ملاحظہ ہو ڈاکٹر محمود حسن الہ آبادی کا مضمون ''اقبال کا حرفِ شیریں'' مشمولہ ''سوز و گدازِ زندگی'' صفحہ 124)

مولوی عبدالسلام ندوی کی کتاب ''اقبال کامل'' کو پروفیسر عبدالحق ایک عمدہ کتابت تصور کرتے ہیں مگر وہیں اس بات پر اظہارِ افسوس کرتے ہیں کہ مولانا نے اقبال کے فکر و فلسفہ کی اہم کتاب ''تشکیلِ جدید الہیاتِ اسلامیہ'' کا کوئی تذکرہ نہیں کیا''

(ملاحظہ ہو مضمون تعمیری ادب اور اقبالیات کا معروف ترجمان پروفیسر عبدالحق از پروفیسر بشیر احمد نحوی۔ سری نگر کشمیر یونیورسٹی، مشمولہ سوز و گدازِ زندگی، ص۔138) پروفیسر عبدالحق علامہ اقبال کو مرزا غالب سے بہتر شاعر قرار

دیتے ہوئے فرماتے ہیں:

۱۔ظاہر ہے وہ (غالب) شاعر تھے مفکر نہ تھے نہ ان کا کوئی تفکر تھا نہ کوئی نظامِ فکر

۲۔دونوں کی دنیا مختلف تھی۔تاریخی وسیاسی منظر نامہ مختلف اور متضاد ہے۔

دونوں شاعروں کا مشاہدۂ آگہی اور اندازِ نظر جداگانہ ہے۔

(سوز وگداز ص۔142)

ہمارے خیال میں اقبال کا غالبؔ یا میرؔ یا کسی بھی شاعر سے تقابل کی چنداں ضرورت نہیں۔اختلاف کے کئی پہلو نکل آسکتے ہیں۔خود علامہ اقبال نے غالب کو خراج عقیدت پیش کیا تھا۔ملاحظہ ہو بانگِ درا:

فکر انساں پرتری ہستی سے یہ روشن ہوا
ہے پرِ مرغِ تخیل کی رسائی تاکجا

بھلے ہی پروفیسر طارق سعید جنابِ عبدالحق کی ہم نوائی کریں ہمارا خیال ہے یگانہ چنگیزی جیسا غالب شکن بھی اگر ہوتا ان کی تائید نہیں کرسکتا تھا۔اس میں شک نہیں کہ اقبال کی فوقیت دیگر شاعروں پر یوں بھی ہے کہ اقبال کے پاس قوم وملت کو بیدار کرنے کے لیے فکر وفلسفہ ہے محض قافیہ پیمائی نہیں ہے۔

❁❁❁

ڈاکٹر سرفراز جاوید

ڈاکٹر عامر محمود (اسلام آباد) کے تحقیقی مقالے پر ایک نظر

ڈاکٹر عامر محمود پاکستان کے نوجوان اسکالر ہیں۔ان کے مختلف موضوعات پر بہت سے مضامین اردو رسائل میں شائع ہوتے رہتے ہیں، جن کے مطالعہ سے ایسا محسوس ہوتا ہے کہ ان کا تحقیقی اور تنقیدی مزاج بہت خوب ہے۔ انھوں نے ہندوستان کی معروف علمی وادبی شخصیت، ماہر اقبال، محقق اور ناقد 'پروفیسر عبدالحق کی تحقیقی وتنقیدی خدمات' پر پی ایچ ڈی کا مقالہ تحریر کیا ہے۔ یہ مقالہ اب کتابی شکل میں منظر عام پر آچکا ہے۔اس سے قبل ڈاکٹر شیراز احمد خاں کا تحقیقی مقالہ ''اقبالیاتی مطالعہ میں عبدالحق کی خدمات'' شائع ہو چکا ہے۔اس تحقیقی مقالہ پر جموں یونی ورسٹی نے ان کو ۲۰۱۲ میں پی ایچ ڈی کی ڈگری تفویض کی تھی۔ڈاکٹر نازیہ رئیس کا ایم فل (دہلی یونی ورسٹی) کا مقالہ ''پروفیسر عبدالحق۔منفرد اقبال شناس'' ۲۰۱۹ میں منظر عام پر آچکا ہے۔اسلام آباد سے ڈاکٹر عامر محمود کا زیر نظر مقالہ عبدالحق کی مجموعی تحریروں کے تجزیہ پر مشتمل ہے۔جس کی فہرستِ عناوین سے یہ ظاہر ہوتا ہے کہ صاحبِ مقالہ نے پروفیسر عبدالحق صاحب کی حالات زندگی اور ان کی تحقیقی وتنقیدی خدمات پر کما حقہ تو نہیں لیکن خاطر خواہ روشنی ڈالی ہے، جو پی ایچ ڈی کے طالب علم کے لئے یہ کافی مشکل امر بھی ہوتا ہے۔ پروفیسر عبدالحق شریف النفس اور نیک انسان ہیں۔

صاحب کتاب نے اس باب میں عبدالحق کی تاریخ پیدائش کے حوالے سے کئی مضمون نگاروں کے اقتباسات نقل کیے ہیں۔جس سے محقق کی تحقیقی کاوش کا اندازہ ہوتا ہے۔مزید یہ بات بھی سامنے آتی ہے۔کہ یومیہ تاریخ میں معمولی مگر سن پیدائش میں کوئی اختلاف نہیں ہے۔ان کی تعلیم وتربیت رسمی وروایتی انداز میں ہوئی۔

صاحب کردار اماں کی تعلیم وتربیت کے اثرات سے عبدالحق کی سرشت میں دین اسلام کی عقیدت اس قدر راسخ ہوگئی۔کہ جس کا اظہار ان کی تقریر وتحریر میں نمایاں طور پر نظر آتا ہے۔کیونکہ انھوں نے اپنے ذوق اور ذاتی مطالعہ کی بنیاد پر قرآن اور اقوالِ رسول اللہ کی فہم پیدا کی۔مزید اقبال کے کلام نے بھی اس ذوق کو پروان چڑھایا۔ہاں دنیاوی تعلیم کا بھی سلسلہ جاری رہا۔اسکول اور کالج کے نصاب درس کے لیے ہندو مسلم اساتذہ کی معقول اور لائق احترام شخصیتوں سے واسطہ رہا۔جن کی تربیت نے ان کے مزاج میں تحصیل علم کا زبردست میلان پیدا کر دیا۔انھوں

نے کالج کی تعلیم کے دوران انگریزی، اردو اور جغرافیہ کے مضامین لیے۔ اردو نصاب کی درس وتدریس کے لیے کلاس روم میں اولین نیازمندی اردو کی معروف شخصیت مجنوں گورکھپوری سے حاصل ہوئی۔ وہ بڑے ذی علم اور لائق وفائق استاذ تھے۔ ان کے علی گڑھ چلے جانے کے بعد ان کا رابطہ بہت ہی مشفق اور قابل احترام استاذ طالب علموں کو تحریکی جذبہ سے سرشار کرنے والی شخصیت پروفیسر محمود الٰہی سے ہوا۔ ان کے علمی اور تحقیقی اثرات نے عبدالحق کو تحقیقی میدان کے سالار کارواں کا اہم سالار بنا دیا۔ ڈاکٹر محمود اس بابت لکھتے ہیں۔:

''مجنوں گورکھپوری کے چلے جانے کے بعد ڈاکٹر محمود الٰہی صاحب نے شعبے کی ذمہ داری سنبھالی وہ بہت شفیق اور خلیق ہونے کے ساتھ ان کے پڑھانے کا انداز بھی مشفقانہ تھا۔ وہ طالب علموں میں شوق ولولے کی تحریک پیدا کرنے میں کمال رکھتے تھے۔ یہ ان کا فضل تھا جس کی بدولت عبدالحق کو اقبال سے کچھ زیادہ لگاؤ پیدا ہوا۔'' (ص۔۱۱)

خالق بشر نے انسان کی ضرورتوں میں بھوک کو مقدم رکھا ہے۔ کسی شخص کا کھانے کے بغیر زندہ رہنا انتہائی مشکل امر ہے۔ انسان معاشرتی زندگی میں تعلیم سے فراغت حاصل کرنے کے بعد فطری طور پر روزی روٹی کی طرف متوجہ ہوتا ہے۔ عبدالحق نے پی ایچ ڈی کی اعلیٰ تعلیم حاصل کی۔ بعدازاں مختلف جگہوں پر عارضی طور پر ملازمت بھی کی۔ مگر ان کا ۲۲ اگست ۱۹۶۸ کو شعبہ اردو دہلی یونی ورسٹی میں اردو لیکچرر کی مستقل اسامی پر تقرر عمل میں آیا۔ اس تعلق سے مصنف نے پروفیسر توقیر احمد خان کے مضمون سے یہ اقتباس نقل کیا ہے۔:

''۲۲ اگست ۱۹۶۸ء کو عبدالحق باقاعدہ لیکچرار مقرر ہو گئے۔ دہلی یونی ورسٹی آرٹس فیکلٹی میں شعبے کے ان دنوں دو حصے ہوا کرتے تھے۔ ایک دن کا اور ایک شام کا۔ شام والی کلاسز کا دوسرا نام پوسٹگریجویٹ ایوننگ انسٹی ٹیوٹ تھا جو بعد میں شعبۂ اردو میں ضم ہو گیا۔ ۱۹۷۱ میں شعبے میں ایک نئی اسامی کی جگہ منظور ہوئی۔ جو مخطوطہ شناسی کی پوسٹ تھی۔ خواجہ احمد فاروقی کی کوششوں سے شعبۂ اردو میں ایک سال کا مخطوطہ شناسی کا ڈپلومہ کورس شروع ہوا تھا۔ پہلے سال کے بیچ میں امتحان ہوا۔ اور عبدالحق صاحب کی پہلی پوزیشن آئی۔ اس زمانہ میں مخطوطہ شناسی کے لیے مورننگ کلاسز میں ایک جگہ مشتہر ہوئی جس پر عبدالحق صاحب کا تقرر عمل میں آیا اور اس طرح وہ

Evening کلاسز سے Morning کلاسز میں آ گئے۔اور با قاعدہ
مخطوطہ شناسی کے استاذ مقرر ہو گئے۔'' (ص۔۱۵)

ڈاکٹر عامر محمود نے کتاب کا اوّل باب ڈاکٹر عبدالحق احوال و آثار کے عنوان سے قائم کیا ہے۔جس کے حوالے سے چند اقتباسات اوپر نقل کیے گئے ہیں۔موصوف نے ان کی حالات زندگی یعنی پیدائش، تعلیم و تربیت، ملازمت، شادی، اولاد، بیرونی سفر، علمی منصوبے، اعزازات، خدمات اور ان کے اخلاق و خصائل کو قلم بند کیا ہے۔اس باب کے مطالعہ سے پروفیسر عبدالحق کی اردو زبان و ادب کے تئیں علمی، تحقیقی اور تنقیدی منصوبہ بندی کا اندازہ ہوتا ہے۔کہ وہ بذات خود ہنوز تحقیقی، تدوینی اور تنقیدی کاموں میں مصروف عمل ہیں مزید اپنے شناسا عالموں اور طالب علموں کو علمی کاموں کی رغبت بھی دلاتے رہتے ہیں۔آج بھی کوئی استاذ اور طالب علم ان سے ملاقات کرتا ہے تو وہ ان سے لکھنے پڑھنے کے بارے میں ضرور معلوم کرتے ہیں۔تاہم وہ ان کے مزاج و ذوق کو سمجھتے ہوئے کوئی نہ کوئی نیا موضوع ان کے گوش گذار بھی کر دیتے ہیں۔جس سے ان کی توجہ نئے موضوع کی جانب مبذول ہو جاتی ہے۔مزید نئے طالب علموں کی تحریر کی اصلاح اور ان کی تربیت بھی کرتے رہتے ہیں، جو ان کی طبیعت کا حسن عمل ہے۔پیرانہ عمر میں بھی اخلاق کی پاسداری کا یہ عالم ہے کہ ہر چھوٹے بڑے کو رخصت کرتے ہوئے مشایعت ضرور دیتے ہیں۔عام طور پر میں نے کسی استاذ کو اس اخلاقی پہلو کی پاسداری کرتے ہوئے نہیں دیکھا۔ڈاکٹر عامر محمود کی اس باب میں کی گئی کاوش پروفیسر عبدالحق کی حالات زندگی پر استناد کا درجہ رکھتی ہے۔

فاضل مصنف نے دوسرے باب میں تحقیق و تنقید کی روایت پر روشنی ڈالی ہے، جو مقالہ کی ضرورت کے مطابق اچھی کاوش ہے۔اس میں موصوف نے تحقیق کے حوالہ سے چند اردو دانشوروں کی آرأ پیش کی ہیں۔مزید اردو ادبی تحقیق کی روایت پر مختصراً روشنی ڈالی ہے۔عہد مغلیہ میں باذوق شخص بہت سے شعرأ کا کلام اپنی بیاض میں نقل کرتے تھے بعد ازاں تذکرہ کی شکل میں شعرأ کی سوانحی حالات بھی قلم بند کرنے لگے۔تذکرہ سے قدرے آگے کی چیز شعرأ کی زندگی اور کلام سے متعلق محمد حسین کی کتاب 'آبِ حیات' ہے۔جو اردو ادبی تاریخ سے تعلق رکھتی ہے۔فاضل محقق نے سرسید، خواجہ الطاف حسین حالی، شبلی، محمود شیرانی، مولوی عبدالحق، قاضی عبدالودود، محی الدین زور، نصیرالدین ہاشمی ڈاکٹر عبدالستار صدیقی اور پروفیسر سید مسعود حسن رضوی ادیب ۔۔۔وغیرہ کا ایجاز سے ذکر کیا ہے۔تدوین نگاری کی روایت اور اس کی تعریف کے حوالہ سے چند دانشوروں کے اقتباسات پیش کیے ہیں۔آخری حصہ میں اکابر ناقدین کا ذکر قدر تفصیل سے کیا ہے۔تیسرا باب عبدالحق کی تحقیقی خدمات کے حوالے سے جائزہ لینے کی طالب علمانہ کاوش ہے۔اس باب میں موصوف نے عبدالحق کی بیشتر کتابوں پر اپنے تاثرات قلم بند کیے ہیں۔انھوں

نے ان کی کتاب 'تنقید اقبال اور دوسرے مضامین' کے جملہ مضامین پر الگ الگ روشنی ڈالی ہے۔اسی طرح دیگر کتابوں کے مشمولات پر خاصی بحث کی گئی ہے۔ڈاکٹر عامر محمود پروفیسر عبدالحق کی تحقیقی خدمات کے حوالے سے لکھتے ہیں۔:

''ڈاکٹر عبدالحق کا شمار عہد حاضر میں اردو زبان کے بہترین محققین میں ہوتا ہے۔جو کہ سرزمین ہندوستان دہلی سے تعلق رکھتے ہیں۔اور اپنے منفرد اسلوب کی وجہ سے اپنی الگ شناخت رکھتے ہیں۔بطور محقق ان کا مطالعہ بہت وسیع اور نظر بہت گہری ہے۔تحقیق کے حوالے سے تقریباً ایک درجن کے قریب ان کی تصانیف ہیں۔اور یہ سلسلہ ابھی جاری ہے۔(ص،۱۱۹)

ڈاکٹر عامر محمود نے ان کی تصنیفات، تالیفات اور تحقیقی کاموں کا جائزہ تو نہیں، ہاں ان پر بھرپور روشنی ضرور ڈالی ہے، جس سے نئے محققین کے لئے ان پر مزید تحقیق کرنے میں کافی مدد ملے گی۔انھوں نے چوتھا باب ڈاکٹر عبدالحق کی تدوین نگاری کا مطالعہ کے عنوان سے قائم کیا ہے۔عامر محمود نے عبدالحق کی مدون کتابوں کا گہرائی سے مطالعہ کیا ہے۔کیونکہ موصوف نے ان کی مرتب کردہ کتابوں کے جملہ مضامین وموضوعات پر خاصی بحث کی ہے۔اور اپنے تاثرات بھی قلم بند کیے ہیں۔وہ باب کے آغاز میں لکھتے ہیں۔:

''ڈاکٹر عبدالحق اردو ادب میں بطور مدون اپنی الگ شناخت بنا چکے ہیں۔جس کا آغاز انھوں نے طلبہ کے لیے تدریسی ضروریات کو مدنظر رکھتے ہوئے ایک مجموعۂ مضامین مرتب کرنے سے کیا تھا۔جس کو جامعات کے اردو نصاب میں شامل کیا گیا۔ڈاکٹر عبدالحق کی تدوینی صلاحیتیں تب کھل کر زیادہ بہتر طریقہ سے سامنے آئیں، جب آپ نے اپنی صدارت کے دوران ایک خبرنامہ، شعبۂ اردو دہلی یونی ورسٹی کی سرگرمیوں کے حوالے سے جاری کیا تھا۔''(ص۔۲۲۱)

اس باب میں ان کی چند کتابوں پر اپنے تحقیقی وتنقیدی تاثرات قلمبند کیے ہیں، جن کے مطالعہ سے یہ معلوم ہوتا ہے، جو بہت تشنہ ہیں تاہم کوئی محقق اور ناقد اس سے صرف نظر نہیں کرسکتا۔ہاں یہ ضرور ہے کہ ان کے تحقیقی اور تنقیدی کاموں پر مزید دقیق جائزہ کی ضرورت ہے۔جس پر موصوف ضرور کام کررہے ہوں گے، مگر ان کی یہ کوشش ومحنت دیگر محققین کے لئے انتہائی معاون ثابت ہوگی، جس میں فاضل محقق نے ان کی بیشتر تحقیقی وتنقیدی خدمات کے

بہت سے پہلوؤں کی طرف اشارہ کیا ہے۔

اس کے بعد ڈاکٹر عبدالحق کی تنقید کا تجزیاتی مطالعہ ہے۔ یہاں یہ عرض کرنا مناسب ہے کہ پروفیسر عبدالحق کو عام طور پر اردو زبان وادب کی علمی دنیا میں ماہر اقبال کے نام سے خاطر خواہ شہرت ملی ہے۔مگر ان کی ناقدانہ شخصیت کے تعلق سے علمی وادبی حلقہ میں توجہ نہیں دی گئی ہے۔جو ان کے ساتھ ناانصافی کے مترادف ہے۔جس پر ادبی دانشوران کو توجہ دینے کی ضرورت ہے۔ان کی تنقیدی نگارشات لائق توجہ اور قابل احترام بھی ہیں۔وہ اردو کے کلاسکی ادب کے علاوہ فارسی زبان وادب سے بھی خاطر خواہ نسبت رکھتے ہیں۔مزید عربی سے بھی شد بد ہے۔ان کے علم کا احساس قاری کو ان کی تحریروں کے بین السطور علمی مباحث کے مطالعہ سے ہوتا ہے۔انھوں نے اپنی تحریروں میں تنقید کے حوالے سے جا بہ جا اظہار کیا ہے۔فاضل محقق نے ان کی تحریروں سے بہت سے اقتباسات نقل کیے ہیں۔ جو عبدالحق کی بصیرت وصلاحیت پر دال ہیں۔مگر ڈاکٹر عامر محمود نے ان کی مبسوط تنقیدی کتاب 'غالب اور غالبیات' پر کچھ نہیں لکھا،شاید ان کو یہ کتاب دستیاب نہ ہوسکی ہو۔اگر یہ کتاب بھی ان کے مطالعہ میں آجاتی تو شاید ان پر چند دانشوروں کی طرح یہ تاثر قائم ہوتا کہ اگر عبدالحق کی یہی کتاب شائع ہوتی ،تو محترم کو اردو ادب میں زندہ رکھنے کے لیے کافی تھی۔تحقیق وتنقید کا کام کبھی مکمل نہیں ہوتا۔ڈاکٹر عامر محمود دوسری اشاعت میں اس کتاب پر ضرور اپنے تاثرات قلم بند کریں گے۔ہنوز اردو ناقدین میں ان کو وہ مقام عطا نہیں ہوا جس کے وہ حق دار ہیں۔ہاں یہ ضرور ہے کہ آنے والی نسل تنقیدی میدان میں ان کے مقام کا صحیح تعین کرے گی، کیونکہ معاصرین ناقدین نے دانستہ یا غیر دانستہ طور پر ان کے تنقیدی کاموں سے صرفِ نظر کیا ہے۔اس باب کے مطالعہ سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ ڈاکٹر عامر محمود نے ان کی تنقیدی بصیرت کو گرفت میں لانے کی کوشش کی ہے۔ جو لائق تحسین ہے۔ہم جب پروفیسر عبدالحق کی تحریروں کا مطالعہ کرتے ہیں تو ان میں بہت سے تنقیدی پہلو ابھرتے ہیں۔جس پر توجہ دینے کی ضرورت ہے۔ہاں چند نوجوان ناقدین کوشش بھی کی ہے۔امید ہے اب یہ سلسلہ دراز ہوتا رہے گا۔ہم غالب تنقید کے حوالہ سے پروفیسر عبدالحق کو نظر انداز نہیں کرسکتے ، کیونکہ انھوں نے غالب اور غالبیات کے حوالہ سے باضابطہ کتاب قلم بند کی ہے، جو غالب تنقید کے تعلق سے خاصی جداگانہ اہمیت کی حامل کتاب ہے۔انھوں نے اس کتاب میں غالب کے کلام کے بارے میں جن امور کی طرف اشارہ کیے ہیں وہ میرے ناقص مطالعہ کی رو سے دیگر ناقدین کے یہاں نظر نہیں آتے۔اس پر مستزاد یہ ہے کہ انھوں نے غالب کے ایک اہم خطی نسخے کو شائع کر کے غالبیات میں اپنا ناقابل فراموش مقام بنایا ہے۔کیونکہ یہ بہت ہی اہم خطی نسخہ ہے۔جو عہد غالب کی ایک قلمی دستاویز ہے۔یہ خطی نسخہ کلام غالب کی تدوین وترتیب میں ناگزیر حیثیت رکھتا ہے۔معاصر تنقید نگاروں میں موصوف کی انتقادی طرز تفہیم سب سے جدا اور

ممتاز ہے۔انھوں نے تنقید کو اعلیٰ تہذیبی اقدار سے ہم آہنگ کر کے ایک انفرادیت بھی قائم کی ہے۔ان میں فکر وخیال کی فرزانگی بہت نمایاں ہے۔ نئے زاویوں اور گوشوں کے ساتھ ان کی تنقیدی نگارشات میں تخلیقی حسن آفرینی کا بہت دلکش اسلوب موجود ہے۔وہ اس دور کے ایک بہت ہی منفرد ادب شناس ہیں۔وہ اردو کے پورے ادبی سرمایہ پر اچھی نظر بھی رکھتے ہیں۔ولی ،حاتم،قطبی سے غالب و ذوق اور دور جدید کے عہد آفریں سرسید،شبلی،اقبال اور رشید احمد صدیقی تک ان کے مطالعہ کا مرکز ومحور ہے۔تحقیق وتنقید کا ایسا خیال افروز امتزاج نایاب نہ سہی کم یاب ضرور ہے۔کلیات ولی،دیوان حاتم،تذکرۂ الٰہی پر لکھے گئے مقدمے ہر اعتبار سے ہماری رہبری کے لیے کافی ہیں۔

ڈاکٹر عامر محمود نے اس باب میں پروفیسر عبدالحق کی تحریروں سے بہت سے اقتباس نقل کیے ہیں جن سے ان کا تنقیدی شعور واضح ہوتا ہے،جس پر معاصرین،ادبی دانشوران اور طالب علموں کو توجہ دینے کی ضرورت ہے۔آخری باب کتاب کے جملہ ابواب کے محاکمہ پر مبنی ہے۔جس میں اختصار کے ساتھ اہم نکات بیان کیے گئے ہیں۔ڈاکٹر عامر محمود کی یہ کتاب پروفیسر عبدالحق کے تعلق سے علمی وادبی دنیا میں ایک اہم دستاویز اور مثالی تحقیقی مقالہ کی حیثیت رکھے گی۔ان پر مزید کام کرنے والوں کے لیے مشعل راہ بنے گی۔ان کے علمی کاموں سے دلچسپی رکھنے والے بہ ہر صورت میں اس کتاب سے استفادہ کریں گے۔

❁❁❁

محمد مرتضیٰ

اقبال کا پیغام نئی نسل کے نام

اقبال بیسویں صدی کے ان عظیم شاعروں میں سے ہیں۔جنہیں شاعری کی ابتدا سے ہی شہرت ومقبولیت قدم چومنے لگی اور رفتہ رفتہ عزت، احترام اور ہر دلعزیزی کی منزل پر جا پہنچے جہاں اب تک اردو کے کسی دوسرے شاعر کی رسائی نہ ہوسکی ہے۔اقبال خداشناس تھے۔کائنات کی حقیقت سے آگاہ تھے۔اسرار کے رازداں اور انسان دوست تھے، وہ عاشقِ رسول تھے، اسی لیے پیغمبرانہ شان سے آدمِ خاکی کو اس کی عظمتوں سے آگاہ کر کے اسے اعلیٰ مقام حاصل کرنے کی ترغیب دی۔ پوری شاعری کا مطالعہ کیجیے تو محسوس ہوگا کہ وہ ایسا انسان کامل وجود میں لانا چاہتے تھے جس کے کردار، گفتار، عزائم اور حوصلہ کی وجہ سے اسے مردِ مومن کا درجہ عطا ہوا اور جو دنیا کو بنانے، سنوارنے اور نکھارنے میں بڑھ چڑھ کر حصہ لے سکے، ان کی شاعری کے پیچھے ان کے احساسات جگ مگاتے ہیں، جذبات مچلتے ہیں، افکار جھلکتے ہیں اور وہ اس بات کی شہادت دیتے ہیں کہ اقبال ایک ایسی دنیا کی تخلیق کے خواہش مند تھے جو جنت نظیر ہو اور اس کے باشندے دلفریب ادا، دلنواز نگاہ اور قلیل امیدوں کے ساتھ عظیم مقاصد کے حاصل کرنے میں منہمک ہوں۔اقبال کی شاعری کا بڑا حصہ ایسے ہی انسان کی تلاش میں نغمہ سرا ہے۔

اقبال کی زندگی انتہائی سادہ لیکن فکر انتہائی بلند تھی۔یہی وجہ ہے کہ دنیا کے عظیم ترین لوگ انہیں پسند تھے۔ اللہ کے بعد اقبال حضرت محمد ﷺ کے حد درجہ مداح تھے۔اسلام سے انتہائی عقیدت کی بنا پر ان کی شاعری میں عربی اور قرآنی استعارے کثرت سے نظر آتے ہیں۔اقبال نے ہر اچھے اور عمدہ موضوع کو جس سے اصلاح کا پہلو نکلتا ہو اپنی نظموں کا موضوع بنایا مثلاً طرابلس کی لڑائی میں شریک ہونے والی ننھی لڑکی جو کہ مجاہدین کو پانی پلاتے ہوئے شہید ہوگئی تھی اس کے بارے میں کہا:

فاطمہ تو آبروئے امت مرحوم

ذرّہ ذرّہ تیری مشت خاک کا معصوم ہے

اقبال کی شاعری نے انہی خصوصیات سے اردو دنیا کے اہل دل، اہل نظر اور صاحبِ فکر حضرات کو اپنی طرف

متوجہ کیا۔ جنہوں نے ان کی شاعری سے اپنے قلب کو گرمایا، روح کو تڑپایا، نظر کو چمکایا اور ذہن کو صیقل کیا۔ اقبال کی اسی مقبولیت نے ہزاروں صاحبانِ قلم کو ان کا گرویدہ بنالیا۔ چنانچہ انہوں نے ان کی شاعری کی مختلف خصوصیات، مختلف پہلوؤں نیز مختلف امکانات کو جاننے کی اور مختلف سمتوں کو پہچاننے کی طرح طرح سے کوششیں کیں۔ جن سے اقبال شناسی میں اقبالیئن کو بڑی مدد ملی۔ بے شک آج ہم کہہ سکتے ہیں کہ ہم نے بہت حد تک اقبال کو ڈھونڈ لیا ہے اور ان کی عظمتوں کو پالیا ہے۔ اس سلسلے میں سیکڑوں مضامین رکتابیں لکھی گئی ہیں، ہزاروں مقالات سپردِ قلم کیے گئے ہیں۔ اور ابھی یہ سلسلہ اور زیادہ زور وشور اور تیز رفتاری کے ساتھ جاری ہے۔ لیکن اب بھی ایسا محسوس ہوتا ہے کہ بہت سے پہلوؤں پر بہت زیادہ کام نہیں ہوا ہے خاص طور سے اقبال کی شاعری کا پوری طرح سے جائزہ لینا ابھی باقی ہے۔ انہی میں اقبال کی وہ شاعری بھی ہے جو انہوں نے محض نئی نسل کے لیے لکھی ہے۔ انہوں نے اپنی قوم کی رہنمائی کے لیے اپنے مستقبل کی قربانی دینے کو ترجیح دی، انقلابی شاعری کے ذریعے نوجوانوں میں ایک نئی روح پھونک دی۔ اقبال نے اپنے کردار سے یہ بات ثابت کرنے کی کوشش کی ہے کہ انہوں نے غلامی کی زنجیروں کو اپنے نوجوانی کے دور میں توڑا اور توڑنے کا سلیقہ بھی سکھایا۔ آج ہم آزاد قوم کے افراد ہونے کے ناتے سے اپنی آزادی کو برقرار رکھنے کے لیے کس حد تک متحرک ہیں اور نوجوان نسل کس حد تک سرگرم عمل ہے۔ یہی طرزِ فکر اقبال کا تہذیبی ورثہ ہے۔ ہم جب اپنے کردار وعمل پر تنقیدی نظر ڈالنے کی صلاحیت پیدا کرلیں گے تو یقیناً قدرت ہمیں آسانیاں عطا کرے گی۔ اور ہم مشکلات پر قابو پانے کی صلاحیت حاصل کرسکیں گے۔ مگر سوال یہ ہے کہ وہ راہِ عمل کیا ہے؟ یہی وہ زاویہ نگاہ ہے جو فکر اقبال کے نئے افق دیکھنے کا حوصلہ بخشتا ہے۔ کچھ تنظیمیں اقبال پر تقریبات کا انعقاد کرتی ہیں، کچھ دانش ور مضامین لکھتے ہیں، جن کا مطالعہ کرنے والے کی تعداد بہت قلیل ہے۔ اور یہ دن گزر جاتا ہے کیا پیغام اقبال ہمیں یہی درس دیتا ہے؟ ہمارے معاشرے کے بہترین نوجوانوں کی منزل دولت اور اسٹیٹس کا حصول ہے۔ اس منزل کا اخروی انجام جو بھی ہو، دنیوی انجام ایک گم نام موت ہے اور ورثہ میں چھوڑی ہوئی جائداد؟ جب کہ اقبال کا راستہ یہ نہیں ہے۔ اقبال نے نوجوانوں کو خدمت کی فکر سے آراستہ کیا ہے اور تصویر کا دوسرا رخ دکھانے کی کوشش کی ہے۔ جہاں ہے تیرے لیے تو نہیں جہاں کے لیے، کے پیرائے میں یہ بات سمجھانے کی کوشش کی ہے کہ انسان کو رب نے بہترین مخلوق قرار دیا ہے، یہ ہمارے لیے عظمت کی دلیل ہے اس لیے اقبال نے کائنات کی تسخیر کا کام اپنے شاہین یعنی نوجوانوں کے سپرد کیا ہے۔ مسلم نوجوانوں کی زندگی صرف یہ نہیں ہونی چاہئے کہ وہ تعلیم اس لیے حاصل کریں کہ انہیں ملازمت مل جائے یا دولت کمائیں؟ بلکہ اقبال نوجوانوں کو ان کا ماضی یاد دلاتے ہوئے کہتے ہیں کہ تمہارے اسلاف نے اس دنیا کی رہنمائی کی ہے۔ اس پس منظر میں اقبال نے جب مسلم نوجوانوں کے طرزِ عمل کا جائزہ لیا، تو انہیں بے حد صدمہ ہوا،

لیکن اقبال ایک باحوصلہ اور پرعزم انسان تھے۔اپنے تعمیری مقاصد حاصل کرنے کے لیے انہوں نے دوطویل تعمیری نظمیں لکھیں جوشکوہ اور جواب شکوہ کے نام سے مشہور ہیں۔لیکن اس سے بھی زیادہ اہم وہ نظم ہے جونوجوانانِ اسلام مخاطب کر کے لکھی گئی ہے۔اقبال نے محسوس کیا ہے کہ مسلمان نوجوان مغربی تہذیب کا لباس پہن چکے تھے اور اس کردار سے دور ہو گئے تھے جو اسلام کا سرمایہ ہے اس تناظر میں اقبال نے نوجوانانِ اسلام کو مخاطب کرتے ہوئے انہیں احساس دلایا ہے کہ وہ تاریخ اسلام کا مطالعہ کریں اور اپنے کردار پر نظر ڈالیں۔

اقبال بزرگوں سے بہت مایوس تھے کیوں کہ وہ جمود اور تقلید کے شکار تھے اور تبدیلی پر مائل نہیں ہوتے تھے۔ اقبال نے بزرگ نسل کے بارے میں یہ کہا تھا:

آئین نو سے ڈرنا طرز کہن پہ اڑنا
منزل یہی کٹھن ہے قوموں کی زندگی میں

اقبال کی آرزو تھی کہ مسلمان نوجوان شاہین بنیں کیوں کہ شاہین ایک ایسا پرندہ ہے جو خوددار اور غیرت مند ہے۔دوسروں کا مارا ہوا شکار نہیں کھاتا، اپنا آشیانہ نہیں بناتا، خلوت پسند، اونچا اڑنا اور تیز نگاہ ہے۔اقبال چاہتے تھے کہ یہی خصوصیات نوجوانوں میں پیدا ہو جائیں وہ ایک مثالی قوم کی تشکیل کر سکتے ہیں۔اقبال نے کہا کہ میں بزرگوں سے ناامید ہوں، آنے والے دور کی بات کہنا چاہتا ہوں، نوجوانوں کو میرا کلام سمجھنا اللہ تعالیٰ آسان کر دے تا کہ میرے شعروں کی حکمت اور دانائی ان کے دلوں کے اندر اتر جائے اور وہ انسانِ کامل بن جائیں:

تو شاہیں ہے پرواز ہے کام تیرا
ترے سامنے آسماں اور بھی ہیں
نہیں تیرا نشیمن قصرِ سلطانی کے گنبد پر
تو شاہیں ہے بسیرا کر پہاڑوں کی چٹانوں پر

اقبال نے اپنے فارسی کلام جاوید نامہ میں نوجوانوں کو مخاطب کرتے ہوئے لکھا ہے، کہ تیری ماں نے تجھے لا الہ کا پہلا سبق دیا تھا، تیری کلی اس کے بادِ نسیم سے کھلی لا الہ کہتا ہے تو دل کی گہرائیوں سے کہہ تا کہ تیرے بدن سے بھی روح کی خوشبو آئے۔اسی طرح اقبال نے اپنی مثنوی اسرار و رموز میں ایک حکایت بیان کی ہے جس میں ایک نوجوان نے سید علی ہجویریؒ سے دشمنوں کا خوف دور کرنے کے لیے رہنمائی طلب کی تو انہوں نے فرمایا اے رازِ حیات سے ناواقف نوجوان تو زندگی کے آغاز اور انجام سے غافل ہے تو دشمنوں کا خوف دل سے نکال دے تیرے اندر ایک قوت خوابیدہ موجود ہے، اس کو بیدار کر۔

اقبال نے اپنی اردو شاعری میں نوجوانوں کو خطاب کرتے ہوئے فرمایا:

کبھی اے نوجواں مسلم تدبر بھی کیا تو نے
وہ کیا گردوں تھا تو جس کا ہے اک ٹوٹا ہوا تارا

اقبال نے نوجوانوں کو خودی کا پیغام دیا اور کہا کہ نوجوان خودشناسی سے خداشناسی کا سفر طے کریں۔ اپنے اندر خوداعتمادی پیدا کریں اور بڑے قومی مقاصد کے لیے اپنے آپ کو دوسروں پر غالب کرنے کی کوشش کریں اور اپنے سماج سے ہر قسم کی برائی کو ختم کر کے ایک مثالی معاشرہ قائم کرنے کی کوشش کریں۔ جس میں امن سلامتی، برداشت، رواداری، اخوت، سخاوت اور محبت جیسی خوبیاں موجود ہوں۔ اقبال چاہتے تھے کہ نوجوانوں کے خیالات بلند ہوں، انسان کامل اور مرد مومن بننے کی خواہش ان کے دل کے اندر موجود ہو۔

اگر نوجوانوں کو اقبال کی تعلیمات سے پوری طرح آگاہ کیا جاتا تو آج کا نوجوان کبھی مایوس اور ناامید نہ ہوتا۔ اور نہ ہی وہ سرمایہ داروں کی اجارہ داری اور بالادستی کو قبول کرنے کو تیار ہوتا۔ آج کے نوجوانوں کا فرض ہے کہ وہ وقت کے چیلنجوں کا مقابلہ کرنے کے لیے اقبال کے پیغام کو سمجھنے کی کوشش کریں تاکہ ان میں وہ خوبیاں اور اوصاف پیدا ہوسکیں جو حالات کا مقابلہ کرنے کے لیے لازم ہوتی ہیں۔ اقبال کی فکر و دانش اور ان کا پیغام آج بھی کارگر ثابت ہوسکتا ہے۔ کیوں کہ ان کے پیغام میں آفاقیت پائی جاتی ہے۔ اور یہ پیغام رہتی دنیا تک ہے۔ موجودہ اور آنے والی نسلیں اقبال کے پیغام سے استفادہ کر کے اپنے ذاتی اور ملکی مسائل حل کر سکتے ہیں۔ آج انتہا پسندی فرقہ واریت اور دہشت گردی نے سنگین خطرات سے دوچار کر دیا ہے۔ نوجوان نسل اقبال کے پیغام کو سمجھ کر ان چیلنجوں کا مقابلہ کر سکتی ہے اور امن اور سلامتی کا گہوارہ بنا سکتی ہے۔ نوجوان موجودہ دور کے موقع پرست اور مفاد پرست کے فریب میں آنے کی بجائے اقبال کے پیغام کی جانب رجوع کریں اور اقبال کی فکر و دانش سے مسلح ہو کر موجودہ حالات کا مقابلہ کریں اور سنگین بحرانوں سے باہر نکالیں۔

حرم پاک بھی اللہ بھی قرآن بھی ایک
کچھ بڑی بات تھی ہوتے جو مسلمان بھی ایک

ان کی شاعری میں خودی، بےخودی، عمل و عشق و محبت جیسے موضوعات ملتے ہیں۔ اقبال ملک و قوم کی خدمت انجام دینا چاہتے تھے۔ اسی لیے انہوں نے اردو نظم کی طرف خاص توجہ دی۔ اپنی مشہور نظم شکوہ جواب و شکوہ میں اقبال نے اتحاد ملت کی دعوت دی ہے۔ اور اپنے پیغام کو شعر کا جامہ پہنایا وہ مسلمان کو اسلامی طرز اختیار کرنے، قرآن پر عامل ہونے اور رسولؐ سے والہانہ تعلق استوار کرنے کا پیغام دیتے ہیں۔ اقبال نے جلیان والا باغ اور مسجد کانپور کی

شہادت کے موضوع پر اپنی مشہور نظم خضر راہ میں عالم اسلام کے انتشار اور جنگ عظیم کی تباہ کاریوں کا نقشہ پیش کیا ہے۔ اس نظم میں اقبال نے صحرائیت پسندی اور تکلف اور تصنع سے نفرت کا اظہار کیا ہے۔ اپنی نظم شمع وشاعر میں اقبال نے نئی نسل کی حضور اکرمؐ سے عشق کا پیغام دیا ہے۔ انہوں نے کہا کہ عشق اس شعلے کا نام ہے جو دل میں بھڑکتا اور انسان کو وصلِ محبوب کے حصول پر ہر لمحہ ابھارتا ہے۔ ان کے مطابق مسلمان اگر اسلامی تعلیمات پر خلوص دل سے عمل پیرا ہو جائیں تو وہ اپنی موجودہ زبوں حالی اور زوال وپستی سے نجات پا کر اپنے ماضی کی عظمت وسربلندی دوبارہ حاصل کر سکتے ہیں۔ اگر نوجوان ایمانی جوش وجذبہ سے کام لیں تو وہ پھر ساری دنیا کو فتح کر سکتے ہیں۔ اقبال نے اس نکتہ کو واضح کیا ہے کہ زندگی محض سانس چلتے رہنے کا نام نہیں ہے۔ بلکہ اس سے پیہم عمل سعی اور کوشش مراد ہے۔ جو فرد یا قوم ان دونوں سے بے گانہ ہے وہ زندہ نہیں رہ سکتی۔ اقبال نے طلبائے علی گڑھ کو مخاطب کرتے ہوئے مسلم نوجوانوں کو عشق خدا اور رسول اور عملی جدوجہد کا پیغام دیا۔ اور اس بات سے آگاہ کیا کہ اربابِ سیاست کی عقل کے طوفان میں بہے چلے جانے کی بجائے عشق حقیقی کو اپنا رہبر بنائیں۔ اقبال نے ایک دوسری نظم میں یہ پیغام دیا ہے کہ انسان اشرف المخلوقات ہے۔ اس لیے اس کی خودی میں غیر معمولی روحانی ترقی کی صلاحیتیں موود ہیں۔ نوجوانوں کی زندگی کا مقصد تو اعلائے کلمۃ اللہ ہے۔ مثلاً اگر مصر میں یہ مقصد پورا نہیں ہوسکتا تو اپنے ہم خیالوں اور دوستوں کو ساتھ لے کر شام کی طرف لے کر چلے جاؤ، جیسا کہ حضرتِ موسیٰ علیہ السلام نے کیا تھا۔ اقبال نے اپنی کتاب میں بیان کر دیا ہے کہ بت شکنی کے لیے ضرب کلیمی کی ضرورت ہے۔ اور یہ طاقت خودی میں ڈوبنے سے حاصل ہوسکتی ہے:

اپنے من میں ڈوب کر پا جا، سراغِ زندگی
تو اگر میرا نہیں بنتا نہ بن ، اپنا تو بن

لیکن خودی میں ڈوبنا مجازی ہے، حقیقت نہیں۔ ڈوبنے سے مراد ہے مطالعہ باطنی (Introspection)، مراقبہ (Meditation)، گیان دھیان (Contemplation) اور معرفتِ نفس حاصل کرنا (Self Knowledge)، من عرف نفسہ فقد عرف ربہ (جس نے اپنے نفس کو پہچان لیا اس نے گویا اپنے رب کو پہچان لیا) دنیا میں وہی قومیں برسر اقتدار آتی ہیں جو ہر وقت مصروف جدوجہد رہتی ہیں۔ اسی لیے قرآن مجید نے مسلمانوں کو ہر وقت جہاد فی سبیل للّٰہ کے لیے تیار رہنے کا حکم دیا ہے۔

اقبال نے ہندوستان کے باشندوں کو رجائیت کی تعلیم دی ہے اور نصیحت کی ہے کہ مایوس نہیں ہونا چاہیے۔ انشاءاللہ ضرور تاریکی دور ہوگی، ناامید ہو جانا سب سے بڑا گناہ ہے کیوں کہ اس کے بعد ترقی کی کوئی صورت باقی نہیں رہتی۔ اقبال نے ''نگاہ شوق'' میں بیان کیا ہے کہ اگر کوئی مسلمان رسول اللہؐ کی تعلیمات سے سرشار ہو کر اپنی خودی کو

مرتبہ کمال پر پہنچائے تو پہلے اس کے اندر ایک انقلاب رونما ہو جاتا ہے پھر وہ دنیا میں انقلاب پیدا کر دیتا ہے۔ اقبال نے اس حقیقت کو بار بار واضح طور پر بیان کیا ہے کہ جب نوجوان اپنے ضمیر کی گہرائیوں میں انقلاب پیدا نہیں کریں گے تو وہ دنیا میں کوئی انقلاب برپا نہیں کر سکتے۔ اسلام ایک ایسا دین یا دستورِ حیات ہے جو نہ تو انسان کو محض دعا پر بھروسہ کرنے کی تلقین کرتا ہے اور نہ محض ذاتی جدوجہد پر اعتماد کرنا سکھاتا ہے بلکہ وہ ان دونوں ضروری باتوں میں ہم آہنگی پیدا کر دیتا ہے۔ یعنی دعا بھی کرو اور جدوجہد سے بھی غافل نہ ہو۔ اقبال کی پوری زندگی، ان کے عملی کام اور شاعری ہمارے لیے بہت سے سبق آموز پہلو رکھتی ہے۔ مثلاً جب آپ جرمنی میں ڈاکٹریٹ کر رہے تھے اس وقت آپ کے فرزند جاوید اقبال نے آپ کو جرمنی خط لکھا اور ''ستار'' لانے کی فرمائش کی، جس کے جواب میں اقبال نے یہ شعر لکھا:

تیری دعا ہے کہ ، ہو تیری آرزو پوری
مری دعا ہے تری آرزو بدل جائے

اقبال نے بال جبریل کی نظم ''ایک نوجوان کے نام'' میں نوجوان کو جس حکیمانہ نکتہ نظر سے تبلیغ کی ہے اس سے پوری قوم مستفید ہو سکتی ہے۔ اگر قوم کے افراد میں زور حیدری اور استغنائے سلیمانی موجود نہ ہو تو بادشاہت بھی کوئی قابل فخر چیز نہیں کیوں کہ وہ بہت جلد زائل ہو جائے گی۔ اقبال کہتے ہیں کہ اے نوجوانوں! تو اگر اسلامی زندگی کے نقطۂ کمال تک پہنچنا چاہتا ہے تو مغربی علوم اور مغربی تہذیب دونوں سے قطع تعلق کر۔ مسلمانوں کی معراج تہذیب مغرب اختیار کرنے سے حاصل نہیں ہو سکتی اس کے لیے نوجوانوں کو اپنے اندر استغنا پیدا کرنا لازمی ہے۔ علامہ اقبال ضرب کلیم میں لکھتے ہیں:

یہ فقر مرد مسلمان نے کھو دیا جب سے
رہی نہ دولتِ سلمانی وسلیمانی

اس شعر میں دولت سلمانی سے مراد شانِ استغنا ہی ہے۔ استغنا سے اقبال کی مراد ہے بے نیازی کا رنگ یعنی مسلمان اللہ کے سوا کسی سے کوئی توقع نہیں رکھتا یہی مومن کی پہچان ہے۔ اس لیے ہر نوجوان کو عشق رسولؐ اختیار کرنا چاہیے۔ یہی ہے اقبال کا وہ پیغام جو انہوں نے 1914 سے 1938 تک اپنی تصانیف کے ذریعہ سے قوم کو دیا۔ اقبال نوجوان کو یقین پیدا کرنے کی دعوت دیتے ہیں یعنی اللہ کی رحمت سے ناامید نہیں ہونا چاہیے۔ کیوں کہ ناامیدی تو انسان کو انجام کار کافر بنا دیتی ہے چنانچہ اللہ فرماتا ہے لا تقنطو امِن رحمة الله (اللہ تعالیٰ کی رحمت سے ناامید مت ہو) اقبال نے قوم کو یقین کا پیغام دیا ہے۔ اگر نوجوان سرکار دو عالم ﷺ کی غلامی اختیار کر کے دنیا پر حکمراں ہو جائے۔

اقبال کہتے ہیں کہ اے نوجوانوں اگر تم رحمت ایزدی سے ناامید ہوجاؤ گے تو تجھ کو علم قرآن اور معرفت الٰہی یہ دونوں نعمتیں بھی حاصل نہیں ہوسکیں گی۔

آخر میں اقبال مسلمان نوجوانوں کو یہ نصیحت کرتے ہیں کہ اگر تو اپنے اندر شانِ استغنا پیدا کرنی چاہتا ہے تو بادشاہوں کی غلامی اختیار کرنے کے بجائے اپنا رزق اپنی قوت بازو سے حاصل کرو۔ اقبال نے اپنی نظم ''نصیحت'' میں قوم کے نوجوانوں کو یہ نصیحت کی ہے کہ اللہ نے تمہیں جوانی اس لیے عطا کیا ہے کہ اپنی خداداد صلاحیتوں سے کام لے کر اپنی دنیا آپ پیدا کر اور اگر نوجوان سخت کوشی کو شعارِ زندگی بنائیں گے تو دنیا کی ساری مشکلات آسان ہوجائیں گی قانون فطرت یہی ہے کہ جدوجہد سے سب مصیبتیں راحت میں بدل جاتی ہیں۔ اقبال کہتے ہیں کہ لطف زندگی عیش وعشرت میں نہیں ہے بلکہ اس جدوجہد میں ہے جو انسان حصول راحت کے لیے کرتا ہے۔ چنانچہ شکاری اس بات کی تصدیق کرسکتا ہے کہ مثلاً ہرن کا شکار کا حقیقی لطف جدوجہد میں ہے نہ کہ اس کے کھانے میں۔

علامہ اقبال نے انسان کو مردِ کامل، مردمومن اور مردِقلندر کے القاب سے نوازا ہے۔ انسان نیتشے کے ''سپرمین'' کی طرح اقبال کا آئیڈیل ہیرو ہے، جس کے ذمّے قوم کی سیاسی اور معاشرتی رہنمائی ہے۔ لیکن نیتشے کا سپر مین روحانیت سے عاری ایک ایسا فرد تھا جس کے نزدیک صرف طاقت ہی زندگی کی بنیادی قدر تھی۔ لیکن اقبال نے اپنے مردمومن کو روحانیت کا سبق پڑھایا تھا تاکہ وہ اپنی طاقت سے دنیا میں انارکی نہ پھیلائے۔ روحانیت کا یہ تصور مشرقی اور اسلامی تصور تھا، جس کے مطابق دنیا میں خدا کی نیابت مردِمومن کی ذمہ داری تھی۔ اس طرح اقبال کے مذہب نے ان کو نہ صرف ''فرد پرستی'' سے باز رکھا، جس کے لیے ترقی پسند ادیب اکثر انہیں الزام دیتے تھے، بلکہ انہوں نے اپنے مردمومن کو اجتماعی مقاصد کا ذمہ دار ٹھہرایا اور اس کی تمام تر قوتوں کا مصرف ملت کی فلاح و بہبود قرار دی۔

اقبال کا خیال ہے کہ عقل کی پیروی انسان کو بزدل بنادیتی ہے اور اسے زمان ومکان کی قید سے باہر نکلنے نہیں دیتی:

خرد ہوئی ہے زمان ومکاں کی زنّاری　　نہ ہے زماں نہ مکاں لاالٰہ الا اللہ
گزر جا عقل کے آگے کہ یہ نور　　چراغ راہ ہے، منزل نہیں ہے

لیکن اگر مردمومن عقل وخرد کے طلسم کو توڑ کر عشق کی پیروی پر آمادہ ہوجائے تو وہ زمان ومکان کی قید سے آزاد ہوجائے گا۔ دنیا میں بظاہر تو انسان فنا ہوجاتا ہے۔ لیکن جب مردِمومن زمان ومکان سے ماورا ہوجاتا ہے تو صحیح معنوں میں وہ لافانی بن جاتا ہے اور اس کے ذریعے سرزد ہونے والے تمام امور بھی دائمی ہوتے ہیں، زمانے کی گردش

انہیں فنا نہیں کر سکتی۔ اقبالؔ نے کئی جگہ اپنے اس خیال کو واضح کیا ہے کہ انسان کی پیدائش اور موت دنیا کے نظام کو قائم رکھنے کا فقط ایک سلسلہ ہے، اگر یہ تسلسل ٹوٹ جائے تو کائنات کا ظاہری وجود متاثر ہوگا۔ زندگی محض فانی اور بے ثبات نہیں، بلکہ زندگی اور موت کی حقیقت کو سمجھنے کی ضرورت ہے۔

اقبالؔ کا خیال ہے کہ انسان اپنی خودی کا اثبات کر کے جب وہ عشق، جہد وعمل، یقین محکم اور فقر واستغنا کی منزلوں سے گزر کر، شر کی قوتوں پر فتح پا کر مرشدِ کامل کا اتباع کر لیتا ہے تو وہ مردِ مومن بن جاتا ہے۔ مردِ مومن طاقت وقوت کا سرچشمہ ہوتا ہے، وہ زمان ومکان کا بھی پابند نہیں ہوتا اور اطاعت الٰہی اور ضبط نفس کے ذریعے اپنی خودی کی حفاظت اور اس کی تربیت کرنا اس کا فریضہ قرار پاتا ہے۔ اب مردِ مومن کو نائب خدا کا منصب حاصل ہو جاتا ہے۔ یہ صورت اس وقت پیش آتی ہے جب انسان خود کو اللہ کے رنگ میں رنگ لیتا ہے۔ اقبال نے مختلف مقامات پر مردِ مومن کی صفات بیان کی ہیں، کہیں انہیں مردِ خرد کہا ہے اور کہیں مردِ قلندر اور مردِ مسلمان۔

مردِ مومن کا کردار چوں کہ لامحدود قوتوں کا مجموعہ ہے۔ اسی لیے انہوں نے اس کی قوت کے استعمال کا راستہ بھی متعین کر دیا ہے۔ اقبال کی نگاہ میں مردِ مومن کو جماعت کا پابند ہے اور بتایا ہے کہ اس کی قوتیں جماعت کی ترقی میں کام آنی چاہئیں۔ اقبال نے ہر فرد کو جماعت اور ملت سے گہرا رشتہ قائم رکھنے کا مشورہ دیا ہے۔ ان کا خیال ہے جماعت کی ترقی فرد کے بغیر نہیں ہو سکتی اور نہ ہی فرد کی ترقی جماعت سے تعلق کے بغیر ممکن ہے، دونوں ایک دوسرے کے لیے لازم وملزوم ہیں۔ مردِ مومن کا خود کو ملت میں ضم کر دینا ہی اس کی زندگی کا مقصد ہے۔

مردِ مومن کا خواب اقبال کا تصورِ زندگی تھا، جسے انہوں نے مابعد الطبیعاتی جہت عطا کی اور یہی جہت ان کی شاعری کو وہ خاص رخ ہے جو انہیں نری حقیقت پسندی سے بلند کر کے ایک ایسا شعری کردار عطا کرتا ہے جس میں خواب اور حقیقت ایک دوسرے سے جا ملتے ہیں۔ اقبالؔ کا یہ تصور ان معنوں میں مابعد الطبیعاتی ہے کہ ان کے خیالات کی بنیاد ایک خاص عقیدے پر مبنی ہونے کے علاوہ ایک ایسی نئی دنیا کی جستجو پر قائم ہے جس میں متضاد حقیقتوں کے یکجا ہو جانے کی گنجائش موجود ہے۔

مردِ مومن کا یہ تصور اقبال کا محض رومانی نہ تھا بلکہ یہ ایک ایسی تاریخ کی طرف اشارہ کرتا ہے جس کا مشاہدہ کھلی آنکھوں سے کیا تھا۔ شاعر کا خیال ہے کہ آج بھی ہے ہم میں وہی جذبے موجود ہیں، ذرا ہمارے اندر قوت اور حوصلہ بیدار ہو جائے، بس بات اتنی سی ہے کہ ہم اپنے بھولے ہوئے سبق کو پھر سے یاد کر لیں۔

علامہ اقبال 2 مارچ 1932 میں اپنے صدارتی خطبہ میں قوم کو یہ مشورہ دیا تھا کہ مسولینی نے اپنی قوم کے نوجوانوں سے کہتا ہے کہ جس طرح ممکن ہو سکے فولاد کے ذخائر اپنے ملک میں جمع کرو تا کہ دشمنوں کا مقابلہ کر سکو۔ لیکن

اقبال اپنی قوم کے نوجوانوں کو یہ مشورہ دیتے ہیں کہ تم خود فولاد بن جاؤ۔ یعنی اپنی خودی کو اس قدر مستحکم کرلو کہ وہ فولاد بن جائے۔

اقبال اپنی نظم میں کہتے ہیں کہ اے نوجوانوں تم یہ چاہتے ہو کہ تمہارے گھر کا صحن آفتاب کی روشنی سے منور ہوجائے تو اپنے صحن اور آفتاب کے مابین کوئی دیوار کھڑی مت کرو۔ یعنی اگر تم یہ چاہتے ہو کہ نوجوانوں کے قلوب اسلام کے نور سے منور ہوجائیں اور ان کے سینوں میں عشق رسولؐ کی آگ روشن ہو جائے تو نوجوانانانِ ملت اور قرآن حکیم کے درمیان کسی قسم کی رکاوٹ پیدا نہ ہونے دو اور اگر ہوگئی ہو تو اسے دور کرو اپنی نظم ''خودی'' میں اقبال کہتے ہیں کہ دولت کے لیے اپنی خودی کو تباہ مت کرو خودی دے کر دولت مت خریدو کیوں کہ کوئی شخص شعلہ دے کر شرر نہیں خریدتا۔ کیوں کہ خودی مستقل بالذات اور پائدار شے ہے اور دولت ناپائدار چیز ہے جس کا کوئی اعتبار نہیں ہے۔ اگر دولت ضائع ہوجائے تو پھر حاصل ہوسکتی ہے لیکن اگر سیرت ضائع ہوجائے تو پھر نوجوانوں کا عدم اور وجود دونوں برباد ہوجائے گا۔

علامہ اقبال نے اپنی فکر کو نئی نسل تک پہنچانے کے لیے قرآن وحدیث کی روشنی میں شاعری، تحریروں، خطبات اور خطوط کے ذریعے اپنا پیغام پہنچایا جس کی وجہ سے اپنے مقصد میں کامیاب رہے۔

محبت مجھے ان جوانوں سے ہے
ستاروں پہ جو ڈالتے ہیں کمند

❁❁❁

عبدالحق

تقدیم

ربِّ کریم نے اپنے پیارے حبیب محمد صلی اللہ علیہ وسلم کو کائنات کی تخلیق کا موجب ومصدر قرار دیا ہے۔ انھیں کی ذاتِ مبارک کے طفیل جہانِ موجود اور ممکنات کی دنیا کو نمود حاصل ہے۔ ہر شے انھیں کی جلوہ گاہ کے نور ونشاط سے کسبِ فیض کرتی ہے۔

یاز نورِ مصطفیٰ ؐ اورا بہاست
یا ہنوز اندر تلاشِ مصطفیٰ ؐ است

وہ ہر گوشۂ زمین پر بارانِ رحمت بن کر برسے اور خار وخس سے محروم زمین کو بھی لالہ وگل کی روئیدگی بخش دی ۔آپ ؐ کی انقلاب آفریں بعثت نے ابرِ نیساں کی طرح انسانی فکر وذہن کو حکمت ودانائی سے گہر بار کیا، ہمارے فکر ونظر کی شادابی اسی سرچشمۂ تخلیق سے مستعار ہے، فکر وشعور کا گراں قدر سرمایۂ ادب اسی ذاتِ گرامی کا فیضان ہے۔اس کی مدح سرائی کے لیے رہ روانِ شوق کی تخلیقی سرگرمیاں فردائے قیامت تک جاری رہیں گی۔ جذب وشوق کا مرکزِ نور وہی ہے ان کی ذات وصفات کے ذکر کو فوز وفلاح کا وسیلہ بتایا گیا ہے انھیں کے اسمِ مبارک کے وظیفے سے اولاد آدم اشرف ہے اور افضل بھی۔ ربِّ جلیل نے اپنے حبیب ؐ کے طفیل بنی نوع بشر کو تسخیرِ کائنات کا راز داں بنایا ہے۔اسرارِ کائنات کی راز کشائی کسی قدر موئے قلم سے ممکن ہوتی ہے۔ یہی قلم وحی وتنزیل کا کاتب ہے اور نبیؐ کے ارشادات کا محافظ بھی ۔ ہر قلم جو ذکرِ رسولؐ میں مشغول ہے وہ رشک آفریں ہے۔ثنائے رسولؐ کے لیے وقف ہر تخلیق صاحبِ ایماں کے لیے جانِ عزیز سے بھی عزیز تر ہے۔ان کی نسبت سے تحریر وتخلیق ہر تحسین سے مستغنی ہوجاتی ہے۔اس خدمت کی بجا آوری سے قلم شاہِ جہانم کہلاتا ہے۔ ربِّ جلیل اور شہِ لولاک کی ذات وصفات کے تذکرے کے لیے ہی قلم مامور ومکلّف کیا گیا ہے۔قلم کے قسم کھائے جانے کا یہی جواز ہے۔ یہی اس کی شہنشاہی ہے۔ ورنہ روسیاہی، حمد وثنا سے قلم مقامِ محمود تک رسائی حاصل کرتا ہے۔ کیوں کہ یہ نورِ ازل کی نمود سے پہلے ظہور میں آنے والی نور فشاں ذات مبارک کی مدح کے لیے مامور ہے۔ صاحبِ قلم بھی صریرِ خامہ کی بدولت قربِ الٰہی کا سزاوار ہوتا ہے۔لوح وقلم کی پاکیزگی سے ہمیں متعارف کرایا گیا ہے۔ ذاتِ باری سے اسے قربِ خاص حاصل ہے۔نوعِ بشر کے ساتھ ہر شے کا کاتبِ تقدیر یہی قلم

ہے۔آفریں ہو ہر اس قلم پر جو رسولِ پاکؐ کی سیرت وشخصیت کو قلم بند کرنے کے کام آیا ہے قلم کی بدولت اسوۂ حیاتِ طیبہ کا ہر نقش ونگار محفوظ کیا گیا۔اسی کی اتباع کو دستورِ دین کا محکم اساس قرار دیا گیا ہے۔ان کے شب وروز کے معمولات کی مکمل پیروی کو ہی حاصلِ حیات فرمایا گیا ہے۔اسے ہی ہر مومن کا شیوۂ کردار وگفتار تسلیم کیا گیا ہے۔یہی سبب ہے کہ دنیا کے کسی فرد کو اس احترام وعقیدت سے نہیں دیکھا گیا اور نہ ہی جان وتن کو قربان کرنے کا بے مثال جذبہ ہی مشاہدے میں آیا۔آخری صحیفۂ آسمانی کی تاکید ہے کہ جب تک ذاتِ گرامیؐ جان سے بھی زیادہ عزیز نہ ہو جائیں۔ہم مومن نہیں ہو سکتے۔آخری نبیؐ کا یہ بے نظیر امتیاز ہے اور اس خاص امتیاز سے اقوامِ عالم میں ان کی امت بھی سب سے ممتاز اور منفرد ہے اس ذات مبارک سے وابستہ ہمارا جذب وجنوں بھی بے عدیل وبے نظیر ہے۔ کائنات کی سب سے بزرگ وبرتر ہستی کے طفیل سے علم وادب کا عظیم الشان سرمایہ وجود میں آیا۔ارشاد واقوال کے ساتھ سیرت وسوانح کا یہ گراں قدر ذخیرہ بھی کسی نبی کا نوشتۂ تقدیر نہ بن سکا۔علوم کے یہ سرچشمے بھی آپ کی ذات کے مرہونِ منت ہیں۔تاریخ وسیر کے ساتھ شعری زبان میں مدح وثنا کے بیش بہا سرمایۂ تخلیق کی تمام تر نسبتیں رسول اکرمؐ سے قائم ہوئیں۔منظوم نغمہ سرائی کا گراں سرمایۂ ادب بھی کسی دوسرے رسول یا رہ نما کی شان میں تخلیق نہ پا سکا۔رسولِ کائناتؐ کے سوا کسی کو یہ منظوم خراجِ عقیدت بھی نہ پیش کیا جا سکا۔ہمیں فخر ہے کہ شعری نذرانے کا سب سے وقیع اور وافر ذخیرہ اردو کے سرمایۂ سخنوری کا گنجینۂ گہر ہے۔دنیا کی سب سے بڑی مسلم آبادی برصغیر میں بستی ہے اس کثیر آبادی کا وسیلۂ اظہار اردو زبان ہے۔جس میں دینی عقائد وافکار کے ساتھ ثقافت کی روح جلوہ گر ہے۔دنیا میں سب سے زیادہ پڑھی جانے والی کتاب قرآن کریم ہے۔قرآن سے متعلق جو ذخیرہ ہے وہ بھی کسی دوسری کتاب کے بارے میں ناپید ہے۔یہ بھی حقیقت ہے کہ اردو میں قرآنی سرمایۂ ادب کا بیش بہا ذخیرہ موجود ہے۔اردو کے اس شرف میں بھی کوئی دوسری زبان شریک نہیں۔عربی وفارسی کے مقابلے میں اردو کم عمر زبان ہے۔مگر اس زبان میں کتاب اور صاحبِ کتاب پر موجود ادب ایک حیرت کدہ ہے۔اردو کم عمر جدید زبان ہونے کے باوجود دینِ مبین سے متعلق سرمایۂ علمی کی تخلیق واشاعت میں دوسری زبانوں پر سبقت رکھتی ہے۔اردو کے شعری تخلیق میں حیرت خیز کرشمہ ساز قوتِ نمو ہے۔حضور رسالت مآبؐ کی ذات قبلہ نما کی ہے جن کے فیضان سے تخلیق پُر نور ہوتی ہے۔ہر سخنور اپنی فہم وذکا اور جذب وشوق کے مطابق شعری وسیلۂ ابلاغ میں نذرانۂ احترام پیش کرتا ہے۔یہی سبب ہے کہ اردو میں نعتیہ ادب کا گراں قدر سرمایہ وجود میں آیا۔آنحضرتؐ کی ذاتِ مبارک اور اوصافِ حمیدہ کے بیان میں عقیدت واحترام، جذب وشوق اور نکات آفرینی کو جس دل کش اور والہانہ اسلوب میں پیش کیا گیا ہے۔وہ سیرت نگاری میں کم نظر آتا ہے یہ اسلوبِ اظہار شاعری میں بڑی وسعتوں کا حامل ہے۔کیوں کہ فکر وخیال کی دنیا، بے کراں امکانات سے روشن ہے۔فن کار ون

نے ان امکانی وسعتوں کو بھی گرفت میں لانے کی کوشش کی ہے اور اپنے تخیلی پرواز سے ذاتِ اقدسؐ سے متعلق نئے نکات منظوم کیے گئے ہیں۔مختلف علامتوں اور رمز وایما کے اشاروں سے سیرتِ رسولؐ کے نکات شعری زبان میں بیان کیے گئے ہیں

لوح بھی تو قلم بھی تو تیرا وجود الکتاب
گنبدِ آبگینہ رنگ تیرے محیط میں حباب
تیری نگاہِ ناز سے دونوں مراد پاگئے
عقل غیاب و جستجو، عشق حضور و اضطراب

گم اس میں ہے افلاک کا بلیغ اشارہ بھی اس ذاتِ مقدس کے لیے ہے۔کیوں کہ فلک الافلاک کی تمام پہنائیاں اسی ذات مبارک میں سمٹ گئی ہیں۔

تحریر وتقریر اظہارِ خیال کے دو وسیلے ہیں۔تحریر زیادہ مفید،مؤثر اور مستحکم ذریعۂ ابلاغ ہے۔اس کے دو اسالیبِ بیان ہیں۔نثر ونظم۔نثر میں سیرتِ رسولؐ پر لکھی جانے والی کتابوں کا حیرت انگیز ذخیرہ موجود ہے۔آپ کی ذات گرامی کی بدولت ایک نئے شعبۂ علم کا اضافہ ہوا۔جسے سوانح نگاری کہتے ہیں۔آنحضرتؐ کی سیرت نگاری سے پہلے اس علم کا فقدان تھا آپؐ سے پہلے کسی پیغمبر یا پیشوا کی سیرت وسوانح کا کوئی نمونہ نہیں ملتا۔آپ کی سیرت وشخصیت پر منظوم ادب کا سرمایہ مختصر ہے۔کیونکہ اس میں جزئیات نگاری پر کم توجہ دی گئی۔فضائل ومناقب،اخلاقِ حسنہ،شبیہہ وشمائل کو بہ طور خاص منظوم کیا گیا یہاں تخیل کی پروازِ بے جا کی گنجائش نہیں ہے۔کفر وایماں کے درمیان بڑے نازک اندیشے حائل ہوتے ہیں جو فن کار کو تخیل کی بے اماں دنیا میں بہکنے سے روکتے ہیں۔ہر ہر قدم پر تابِ گفتار بس کہہ کر ٹھہر جاتی ہے۔بہ قول عزت بخاری یہ شہِ لولاک کی جلوہ گاہ ہے جو زیرِ آسماں عرشِ عظیم سے بھی نازک تر ہے۔یہاں تو جنید بغدادی اور بایزید بسطامی بھی سانس روک کر حاضر ہوتے ہیں۔

ادب گاہیت زیرِ آسماں از عرش نازک تر
نفس گم کردہ می آید جنید وبایزید ایں جا

شاعری کا سرچشمہ تخیل ہے۔مگر آنحضرتؐ کے ذکرِ میں تخیل کو محدود اور محبوب فضاؤں میں ہی پرواز کی اجازت ہے۔اس تاکید کو پیشِ نظر رکھتے ہوئے شعرا نے معجزہ ہائے ہنر کی مثالیں قائم کی ہیں۔آپؐ کی تعریف وتوصیف میں کہے گئے اشعار صنفِ ادب میں نعت کہلائے۔بعد ازاں منظوم سیرتِ پاک بھی قلم بند کیے گئے۔علامہ اقبال اوپن یونی ورسٹی اسلام آباد میں ڈاکٹریٹ کی ڈگری کے لیے داخل کیے گیے مقالے میں تقریباً سو منظوم سیرت

پاک کی فہرست دی گئی ہے۔عصرِ حاضر میں رقم کی گئیں کئی منظوم تخلیقات میرے پیشِ نظر ہیں۔قیصرالجعفری کا 'چراغِ حرا' لانبہ کا 'کلام ناطق' چندر بھان خیال کا 'لولاک' منیر احمد جامی کا 'وجہِ کل' سید غضنفر کا 'حرزِ جاں' (زیر اشاعت) اور اٹھارہ ہزار سے زائد اشعار پر مشتمل لطیف اکبرآبادی کا 'اذکار لطیف' حیرت خیز یادگار ہیں۔بیسویں صدی سیرت نگاری اور نعت گوئی کا عہدِ گل ہے۔سیرتِ رسولؐ کو قلم بند کرنے کی جو کوشش اس صدی میں کی گئی وہ بے مثل اور قابلِ رشک ہے۔انیسویں صدی میں سرسید کی تحریر مشعلِ راہ بنی اور ان کے رفیق کار مولانا شبلی نعمانی نے بیسویں صدی کے آغاز میں سیرۃ النبیؐ قلم بند کر کے اس فن کو مہرِ جہاں تاب کی روشنی بخش دی۔یہ امر غور طلب ہے کہ بیسویں صدی کے نصف اول میں پیغمبرِ اعظم وآخرؐ پر جو ذخیرۂ ادب وجود میں آیا وہ کسی فکری انقلاب سے کم نہیں ہے۔حالؔی کا یہ شعر زبانِ عام پر آوازِ دروں کی طرح جاری ہوا۔

وہ نبیوں میں رحمت لقب پانے والا
مرادیں غریبوں کی برلانے والا

روئے زمین پر ملت کی سب سے بڑی آبادی محکوم تھی اور مغربی عقیدہ وافکار سے مغلوب بھی صلیب وشہادت کے سوا سبھی راستے بند تھے۔اس آزمایش میں آنحضرتؐ کی سیرت وشخصیت کا انقلاب آفریں پیغام ہی ہر مرض کا مداوا سمجھا گیا۔ایمان وآگہی کی سلامتی کے ساتھ مغرب کی غلامی سے آزادی کے لیے آپؐ کی ذاتِ مبارک کو ہی نسخۂ شفا سمجھا گیا۔اقبال جیسے دانائے راز بھی اپنی تمام تر فکری یافت وآگہی کو ذاتِ مبارکؐ کا عطیہ تسلیم کرتے ہیں۔

ایں ہمہ از لطفِ بے پایانِ تست
فکرِ ما پروردۂ احسانِ تست

(پس چہ باید کرد)

اقبال صدقِ دل سے معترف ہیں کہ حضورِ اکرمؐ کے بے کراں فیضان نے ہی ان کے فکر ونظر کو بالیدگی اور بلندی بخشی ہے۔گویا ان کے فکری نظام کا مصدرِ اعظم آپ کی ذاتِ گرامیؐ ہے۔خاکِ مدینہ ہی ان کے لیے سرمۂ نور ہے اسی نے ان کے لوح وقلم کو دروں بینی عطا کی ہے۔عالمِ آب وخاک میں ہر شے کو انھیں کے ظہور سے فروغِ نظر حاصل ہے اور ہر ذرۂ ریگ کو طلوعِ آفتاب کی تابانی اسی ذاتِ اقدسؐ کے پرتوِ مہر سے ملتی ہے۔اس کے در تک رسائی ہی دین ودانش کی معراج ہے۔

اگر بہ اونہ رسیدی تمام بولہبی است

فکری سطح پر یہی خیال اس دور کے ہر صاحبِ ایمان کے قلب ونظر میں جاگزیں ہے۔کیوں کہ بہ قول اقبال:

از خدا محبوب تر گردد نبیؐ

اس عہد کے نگارشاتِ قلم کا قابلِ قدر حصہ اسی ذات مبارکؐ سے متعلق ہے اور منسوب بھی۔ نعت ومناقبِ رسولؐ سے متعلق تقریباً ہر فن کار کے تخلیق میں حوالے موجود ہیں۔ تخلیق کی اس فروزاں کیفیت اور فرزانگی پر حیرت ہوتی ہے اور بشاشت قلب بھی حاصل ہوتی ہے۔ اس تخلیقی فیضان پر غور کرنے کی ضرورت ہے۔ کئی زندۂ جاوید نظمیں لکھی گئیں۔ شبلی کا شہر آشوبِ اسلام، حالی کا مدوجزرِ اسلام، اقبال کا طلوع اسلام، شکوہ وجواب شکوہ وغیرہ تخلیقات نے خاص وعام کے محسوسات کی دنیا بدل دی۔ ان تخلیقات کا مرکزی نقطہ حضور رسالتِ مآبؐ کی ذات ہے شعری بیانیے کی ہر جہت میں اسی ذات گرامیؐ کے آثار واشارے سے کشتیٔ فکر رواں ہوتی ہے۔

کہ محمدؐ سے وفا تو نے تو ہم تیرے ہیں
یہ جہاں چیز ہے کیا لوح وقلم تیرے ہیں

شہر وقصبات میں نعت خوانی کی محفلیں آباد ہوئیں۔ طرحی وغیر طرحی مشاعروں سے ادبی فضائیں منور ہوئیں۔ ولادت باسعادت کی مبارک تقریبات نے نعت گوئی اور ذکرِ رسالت مآبؐ کو صبح وشام کے وظیفے کا معمول بنا دیا۔

سلام اے آمنہ کے لال اے محبوبِ سبحانی
سلام اے فخرِ موجودات فخرِ نوع انسانی
مصطفیٰ جانِ رحمت پہ لاکھوں سلام
شمعِ بزم ہدایت پہ لاکھوں سلام

ان روح پرور نغموں نے شہر ومضافات کی فضاؤں کو نوری وحضوری سے معمور کیا۔ یہ سلسلہ تا حال وفورِ شوق اور جذبِ دروں کے ساتھ جاری ہے۔ ادب اور اقدار سے بیزار اور بغاوت کرنے والے مکروہ فکر کے حامل ترقی اور جدیدیت پسند بھی سیرتِ رسولؐ کے جذبے کو سلام کرنے پر مجبور ہوئے۔ اس قبیلے کے کئی شعرا کا کلام انتخاب میں شامل ہے۔ ان کی فکری کج روی کے باوجود ان کی عقیدت وارادت قابلِ تحسین ہے۔ اس تحریک کے شور وغوغا سے مجموعی طور پر ادب کا نقصان ہوا۔ مگر نعت گوئی کا سلسلہ رواں دواں رہا۔ حیرت ہوتی ہے کہ ذہنی فساد وفسوں کے دور میں شاہ نامۂ اسلام تخلیق کیا گیا جس میں تاریخ وتہذیب کے اعلیٰ اقدار نے تخلیق کی قابلِ رشک مثال پیش کی۔ ولادت باسعادت کے اشعار نے برصغیر کے ہر گوشۂ زمیں کو سوز وسرور سے سرشار کیا۔ علامہ اقبال اپنے جا بجا بکھرے اشعار سے ذات رسالت مآبؐ کو حکمت ودانائی کا نذرانہ پیش کرتے رہے۔ انہوں نے نعتِ رسولؐ کو نئی جہت دی اور ممکنات کی دنیا آباد کی۔ ان کی غزل کے یہ دو شعر محاورۂ نعت بن کر ہر خاص وعام کے طرزِ بیان کو تازگی سے آشنا کیا۔

وہ دانائے سبل ختم الرسل مولائے کل جس نے
غبار راہ کو بخشا فروغِ وادیٔ سینا
نگاہِ عشق ومستی ہیں وہی اول وہی آخر
وہی قراں وہی فرقاں وہی یٰسیں وہی طاہا

نعت میں محبت وارادت کی جگہ مقاصدِ رسالتؐ کے حکیمانہ پیغام کو پیش کرنے کا جذبہ پیدا ہو۔ رحمتِ عالم کے ساتھ محسنِ انسانیت کے پہلو پر توجہ دی گئی اور بنی نوع بشر کی فلاح و بہبود کے سب سے عظیم داعی کے طور پر پیش کیا جانے لگا۔ سرمایہ ومزدور کی کشاکش میں ہر جبر وظلم کے خلاف آپ کی انقلاب آفریں آواز کو لبیک کہا گیا۔ سیرت پاک کے اس انقلابی پہلو کو نعت میں خاص توجہ دی گئی۔ نعرۂ انقلاب کی صدا دینے والے شاعر جوش کے اشعار ملاحظہ ہوں:

تیرے قدم پہ جبہ سا روم وعجم کی نخوتیں — تیرے حضور سجدہ ریز چین وعرب کی خودسری
تیرے کرم نے ڈال دی طرح خلوص وبندگی — تیرے غضب نے بند کی رسم ورہِ ستم گری
تیری پیمبری کی یہ سب سے بڑی دلیل ہے — بخشا گرائے راہ کو تونے شکوہِ قیصری

بعثتِ رسالت مآبؐ کی نئی تعبیروں یا ان کی تجدید نو نے نعت گوئی کے امکانی زاویوں کی راہ روشن کی۔ احسان دانش کے یہ اشعار ملاحظہ ہوں:

مگر حد سے بڑھا جب ظلم مزدوروں غلاموں پر — سزائیں برملا ملنے لگیں جب نیک کاموں پر
نحیفوں کو سہارا مل گیا الطافِ باری کا — درِ افلاس پر سر جھک گیا سرمایہ داری کا
غلاموں کو دیا اس شان سے پیغامِ آزادی — کہ گردش میں ہے تیرہ سو برس سے جامِ آزادی

گویا نعت نگاری میں کرۂ ارض کے معاملات کی ترجمانی نے ایک نئے عنوان کو متعارف کرایا۔ اوران سلگتے ہوئے مسائل کا شافی علاج دامنِ رسولؐ میں پایا گیا۔ اس نئے عنوان کی تازگی وطرح داری کا آغاز اقبال نے اپنی پرشکوہ نظم 'خضرِ راہ اور طلوعِ اسلام میں (۱۹۲۳ء) میں ایک بشارت بھری آواز سے کیا تھا۔

تمیز بندوآقا فسادِ آدمیت ہے
حذر اے چیرہ دستاں سخت ہیں فطرت کی تعزیریں

تقریباً ہر صنفِ شعر میں نعتِ رسولؐ قلم بند کی گئی ہے۔ یہ بذاتِ خود ایک صنف ہے مگر قصیدہ، مثنوی، نظم وغیرہ میں بھی نعت کثرت سے موجود ہے۔ ہیئت کے اعتبار سے بھی مختلف فنی صورتوں میں وافر مثالیں ملتی ہیں۔ عروض کی پابندیوں کا بھی احترام کیا گیا ہے۔ نئے تجربے بھی کیے گئے ہیں۔ ہر زمانے میں تخلیق کے علاوہ اسے فکر وتحقیق کا

خاص موضوع قلم قرار دیا گیا۔آزادی کے بعد دانش گاہوں میں تحقیق کا کام شروع ہوا۔ڈاکٹریٹ کی سند کے لیے ملک میں سب سے پہلے سید رفیع الدین کو اردو میں نعتیہ شاعری کے تحقیقی مقالے پر ۱۹۵۶ء میں ناگپور یونی ورسٹی نے ڈاکٹریٹ کی ڈگری تفویض کی تھی۔۱۹۷۶ء میں یہ مقالہ پاکستان سے شائع ہوا۔بعدازاں نعت ریسرچ سینٹر انڈیا سے دوبارہ شائع کیا گیا۔پاکستان میں ڈاکٹر ریاض مجید کا قابل قدر تحقیقی مقالہ شائع ہوا۔رحمتِ رب ہے کہ رودِ رواں کی طرح یہ سلسلہ ہنوز جاری ہے۔تخلیق اور فن سے متعلق نئے گوشے اور نئے نکات سامنے آرہے ہیں۔تنوع اور بے کراں وسعتوں کا حامل یہ موضوع مطالعہ میں روز افزوں ہے۔اسی طرح انتخاب کا سلسلہ بھی جاری ہے۔کئی انتخابات سامنے ہیں۔ایک نئے انتخاب کی ضرورت اور مطالعے کے پیش نظر یہ کوشش ایک عاجزانہ پیش رفت ہے۔ہر کوشش تکمیل طلب ہوتی ہے۔مکمل اور حرفِ آخر اللہ کی ذات ہے۔

راقم نے عہدِ قدیم کے نعتیہ کلام سے انتخاب کا آغاز کیا ہے۔کیوں کہ وہ ہمارا قدیم اور بہت وقیع سرمایہ ہے۔ہماری ادبی تاریخ خسرو کے مشکوک اور مشتبہ کلام سے نہیں شروع ہوتی۔یہ ایک مغالطہ ہے۔ان کے اردو کلام کے وجود کا کوئی پختہ ثبوت نہیں ملتا۔اس کے برخلاف انھیں کے معاصر ملا داؤد کا کلام معتبر اور تحقیق شدہ ہے۔اس عہد کے مخطوطات کی موجودگی سے اس متن کی صحت میں کوئی شک نہیں رہتا۔ہماری بدتوفیقی تھی کہ اردو کو صاف وشستہ اور شہری زبان بنانے کے شوق بے جا میں انھیں تسلیم کرنے سے گریز کیا گیا۔جب کہ ہندی والوں نے بخوشی اپنا لیا اور ہم محروم رہے۔یہی سلوک جائسی اور کبیر کے ساتھ بھی کیا گیا۔ناچیز نے پدماوت کے نعتیہ اشعار کو بھی شامل کیا ہے۔دکن کے قدیم شعراء کا بھی انتخاب ہے جو بیشتر مثنویوں سے ماخوذ ہے۔قدیم دور کے لسانی اظہار کا مطالعہ ضروری ہے۔قدیم ثقافتی سرمایہ ہماری سرخ روئی کا سبب ہے۔ان سے گریز پائی ہماری کم نگہی اور بدنصیبی ہوگی۔زبان وبیان کے انداز مشکل اور کم مانوس ہی سہی۔ادب کے ارتقائی اسلوب کے مطالعہ کے لیے قدیم طرزِ نگارش کی تفہیم واجب ہے۔یہ صرف ادب نہیں ہے بلکہ ذات رسالت مآبؐ کے ذکر پر مشتمل عقائد وایمان کا انمول رتن ہے۔جنوب وشمال کے مشترک اقدار وادب کے ترجمان ولی ہیں۔جسے شمالی ہند کا پہلا نعتیہ قصیدہ نگار کہہ سکتے ہیں۔انہوں نے جمال آفریں قصیدہ قلم بند کیا۔قصیدے کے بھرپور آہنگ وشکوہ کو برقرار رکھتے ہوئے مذہبی جمالیات کے ساتھ قصیدہ نظم کیا۔

عشق میں لازم ہے اول ذات کو فانی کرے
ہو فنا فی اللہ دائم یادِ یزدانی کرے
جس مکاں میں ہو تمہاری فکرِ روشن جلوہ گر
عقل اول آکے واں اقرارِ نادانی کرے

عارفاں بولیں گے جان ودل سوں لاکھوں آفریں
جب ولی تیری مدح میں گوہر افشانی کرے

شاہ حاتم نے نعتِ رسولؐ کو دوسری ہیئت میں نظم کیا ہے۔ ولی کے بعد سوداؔ کا لافانی قصیدہ ہمارے نصاب کا مقبول حصہ بنا۔ ان کی روایت نے قصیدہ نگاری کو تلاطم خیز بنا دیا۔ یہ حیرت کی بات ہے کہ خواجہ میر دردؔ، میر تقی میرؔ غالب اور ذوق نے اردو نعت نگاری پر کم توجہ دی، مومن نے بھرپور تلافی کی اور اس شاہراہ کو چراغاں کیا۔ نئے موضوع، نئے اسالیب اور نکاتِ نو سے سرشار یہ صنفِ ادب روز افزوں ترقی کرتا گیا۔ نعت کے انتخاب میں علمی وادبی اسالیب کے ساتھ جذبہ وفکر کے محسوسات پیش نظر رہے ہیں۔ یہ نازک فن ہے ہم کسی بھی تخلیق کو کم وبیش کے میزان پر نہیں رکھ سکتے۔ ہم درجہ بندی بھی نہیں کر سکتے۔ معیاری اور غیر معیاری کی گفتگو بھی مناسب نہیں ہے۔ راقم بس اتنا کہہ سکتا ہے کہ اس قید وبند کے زمانے میں ناچیز کو جو سہولت سے مل سکا وہ کلام انتخاب میں شامل ہے۔ اس انتخاب میں دانش گاہوں کے نصابات پیشِ نظر ہیں۔ یہ بھی ذہن میں تھا کہ نعت پاک کا ایک ایسا مجموعہ شائع کیا جائے۔ جو ہماری نصابی ضرورت کی کفالت کر سکے تاکہ نسلِ نو جواں کی فکری تربیت میں یہ معاون ہو سکے اور شائقینِ ادب کے لیے مزید تشویق کا سامان فراہم کر سکے۔ اپنی بے بضاعتی اور کوتاہیوں کے ساتھ جو بن پڑا وہ حاضر کر رہا ہوں۔ ناچیز عزیز محترم پروفیسر شہاب الدین صدیقی کے پُرخلوص تعاون کا احسان مند ہے انہوں نے اس عاجز کو چراغِ رہ گزر کی روشنی فراہم کی۔ عزیزم ڈاکٹر سراج احمد قادری کے ہمہ وقت تعاون اور کرم نوازی کے لیے ممنونِ التفات ہوں۔ عزیزم ڈاکٹر محمد شاہد خاں نے بڑے ذوق وجذبے سے میری مدد کی۔ ربِّ جلیل سے دعا ہے کہ وہ ان دوستوں کے مبارک سلسلۂ شوق کو شرفِ قبولیت بخشے اور نعمتِ دارین سے سرفراز کرے۔ آمین

عبدالحق

تیرا وجود الکتاب

ذکرِ رسولؐ میں مشغول ہر قلم اور تحریر ہزار بار رشک آفریں ہے وہ اپنی تحریم وتقدیس پر جتنا بھی ناز کرے کم ہے۔اسی وظیفے سے قلم شاہِ جہانم کہلاتا ہے۔ربِّ جلیل اور شہِ لولاکؐ کی ذات وصفات کے بیان کے لیے ہی قلم کو مامور ومکلّف کیا گیا ہے۔یہی اس کی شہنشاہی ہے ورنہ روسیاہی۔قلم کو فسق وفساد کو رقم کرنے سے باز رکھا گیا ہے۔ یہ حسنِ ازل کی نمود سے پہلے کی مبارک ذات نورِ محمدؐ کی جلوہ گاہ کا ترجمان ہے۔اسی ذات کی نور فشانی سے ارض وسما جہاں تاب ہیں۔اسی کی جمال آفرینی سے کونین کے مظاہر بھی روشن ہیں۔اس ذکرِ حبیبؐ سے صاحبِ قلم بھی ہر داد سے مستغنی ہوتا ہے۔کیوں کہ وہ ثنا خوانی سے کائنات کی سب سے محترم ذات کے قرب سے شرف یاب ہوتا ہے۔ پروفیسر غضنفر کی یہ سعادت قابلِ رشک ہے اور باعثِ افتخار بھی کہ اردو اساتذہ میں ایک صاحبِ نظر فن کار موجود ہے۔ جس نے ناموسِ رسالتؐ کے پاسِ احترام کو موضوعِ سخن بنایا اور دامنِ ادب کو صرصر عصیاں سے محفوظ رکھنے کی مثال قائم کی ہے'حرزِ جاں' ان کے تخلیقِ ہنر کا بیش بہا ارمغان ہے۔خالق کون ومکاں نے ذاتِ رسالت مآبؐ میں ہر 'کربِ جاں' کی آسودگیٔ قلب ونظر کا راز پنہاں رکھا ہے۔پروفیسر غضنفر کو بھی اسی ذکرِ دل کشا کی دستک راس آئی ہے ۔اس سے قبل وہ ناول،افسانوں خاکوں اور خودنوشت قلم بند کرتے رہے۔'کربِ جاں' ان کی پہلی مثنوی ہے۔ان کمیں گاہوں میں صحبتِ صاحب نظراں کا سراغ نہ ملا۔نہ سینہ ہی روشن ہوسکا۔شکر ہے کہ وہ پایانِ کار دانائے سبل ختم الرسلؐ کے ذکر میں مشغول ہوئے۔

نہ کہیں جہاں میں اماں ملی جو اماں ملی تو کہاں ملی

اہلِ ایماں کے لیے آخری صحفِ سماوی کی بڑی حکیمانہ تاکید ہے کہ جب تک نبیؐ تمہاری جانوں سے بھی زیادہ عزیز تر نہ ہوجائیں تم مسلمان نہیں ہوسکتے۔'اَلنَّبِیُّ اَوْلٰی بِالْمُؤْمِنِیْنَ مِنْ اَنْفُسِھِمْ' میں مسلمان ہونے کا یہی میزان ومعراج ہے۔پروفیسر موصوف غیروں کی اور اپنی رام کہانی لکھتے رہے مگر اب دامنِ رسالتؐ پناہ میں سرخ رو ہورہے ہیں۔اللہ اس کاوشِ قلم کو قبول فرمائے۔آمین

پروفیسر غضنفر کے قلم کی ثنویت کا جوہر کسی حیرت کدہ سے کم نہیں ہے۔ نثر کے ساتھ طویل بیانیہ کو نظم کرنے کی قدرت فیضانِ سماوی کا عطیہ ہے۔ اس کی مثال تاریخ ادب میں اسرارِ فن کی راز کشائی سے کم نہیں، نزولِ تخلیق کے نور سے ہی سینۂ شاعر بھی روشن ہوتا ہے اس کی موجودگی سے تخلیق کے لافانی چشمے پھوٹتے ہیں اور نقشِ دوام ثبت کرتے ہیں۔ ادب اقدارِ عالیہ کا مظہر ہوتا ہے اگر اس کی ترجمانی میسر نہ ہو تو سب کارِ ہوس ہے تخلیق کا معاصر منظر نامہ پیش نگاہ ہے جو نور و نظر سے محروم اور مردہ و افسردہ ہے۔ قیصر الجفری نے 'چراغ حرا' لانبہ نے 'کلامِ ناطق' چندر بھان خیال نے 'لولاک' منیر احمد جامی نے 'وجہ کل' منظوم سیرتِ رسول ؐ قلم بند کر کے شعری پاکیزگی کو بلندی و برگزیدگی بخشی ہے۔ جے پور کے کہنہ مشق شاعر لطیف اکبر آبادی نے چند دنوں قبل اٹھارہ ہزار سے زائد اشعار پر مشتمل 'اذکارِ لطیف' میں حیات طیبہ کو منظوم کیا ہے۔ اس موضوع پر علامہ اقبال اوپن یونی ورسٹی اسلام آباد میں داخل کیے گئے تحقیقی مقالوں کی بڑی تعداد حیرت خیز ہے۔

پروفیسر غضنفر کا یہ منظوم سیرتِ طیبہ ؐ ایک دوسرے درخشاں امکان کا اشارہ ہے، اللہ ان کے قلم کی روشنائی کو سیرتِ سرورِ کائنات ؐ کے مجاہدات کو رقم کرنے کے لیے مزید رواں رکھے اور قارئین کے نور و نظر کو عرفان و آگہی سے ہم کنار کرتا ہے۔ (آمین) نظم کی تخلیق میں پروفیسر غضنفر کا جذب و شوق ایماں بدوش ہے۔ اس میں شرارِ فن اور خونِ جگر کی حرارت بھی ہے۔ ایسے فن سے صرفِ نظر کرنا کوتاہی و کم نگہی ہی نہیں تقدیر ساز قوت اور متاعِ لوح و قلم سے محرومی ہے۔ نظم کا ابتدائیہ بے حد پُرکشش اور کیف پرور ہے۔ اختتامیہ میں وہ خروشِ احساس نظر نہیں آتا۔ دعائیہ کلمات اثر آفریں ہیں جس حیاتِ طیبہ کے لیے لاکھوں صفحات کم ہوں اسے اس اختصار میں بیان کرنا تشنگی ہے مثنوی موتی کی مسلسل لڑی صحیح مگر وسعتِ بیان کے لیے اور بھی سینکڑوں جلی عنوان ہیں جنھیں منظوم کیا جانا چاہئے۔ تسلسلِ بیان میں اہم واقعات کی سرخی بھی قلم بند کی جانی چاہئے۔ مثنوی نگاروں نے اس کا بڑا اہتمام کیا تھا جو بہت مناسب بھی تھا۔ حفیظ جالندھری کے شاہ نامہ کی بھی یہی روایت ہے۔

نہیں مثنوی یہ تو ہے حرزِ جاں

میر حسن کا تعارف یاد آتا ہے

نہیں مثنوی ہے یہ سحر البیاں

یہ بیانیہ روانی اور زبان کی سادگی و سحر کاری سے ہم آہنگ ہے۔ ربِّ کریم سے دعا کرتا ہوں کہ ایسی نور فشاں نظمیں بار بار پڑھنے کو ملتی رہیں۔

'کریما ایں کرم بارِ دگر کن'

پروفیسر عبدالحق

تبریک وتحسین

محترم نسبتوں پر نازِ بے جا کا بھی جواز ہے۔ڈاکٹر خالد ندیم کی پہچان کے دو برگزیدہ وسیلے ہیں۔انہوں نے اپنے علمی شناس نامے کو شبلی و اقبال سے منسوب کیا ہے۔ادب میں ان جہاں تاب سیاروں کے روبرو تخلیق کا عالمِ افلاک سرنگوں ہے۔جریدۂ عالم پر ثبت ہو یا نہ ہو مگر ابھی تک ان کا کوئی ہمسر وہمنوا پیدا نہ ہوسکا۔شاید ابھی بہت دنوں تک تخلیق کی بے نور نگاہوں کو مردِ غیب کا انتظار کرنا پڑے۔دونوں اس لیے عظیم ہیں کہ انہوں نے کائنات کی سب سے بزرگ و برتر ذات گرامیؐ سے اپنی نسبت قائم کی ہے۔راقم کا یقین وثبات ہی نہیں اقبال کا اقرار ہے۔

فکرِ ما پروردۂ احسانِ تست

ڈاکٹر خالد ندیم کا دوسرا رشتہ و پیوند سلسلۂ درس وتلمیذ سے ہے۔وہ اقبال شناسی کے محترم ومقتدر شناور ڈاکٹر رفیع الدین ہاشمی کے خانوادۂ علمی میں ممتاز ومنفرد مقام رکھتے ہیں۔عصر حاضر میں ناچیز کے نزدیک ڈاکٹر ہاشمی اور ڈاکٹر تحسین فراقی کا اقبالیاتی مطالعہ رشک آفریں ہے۔ان بزرگوں کے فیضانِ نظر کی کرشمہ ساز جلوہ گاہ میں ان کے شاگردوں کی ایک کہکشاں آباد ہے۔پتھروں پر ایٹریوں کی رگڑ نہ سہی مگر ان کی سعی وسعادت سے علمی رودِ رواں کے چشمے جاری ہیں۔شبلی کی آپ بیتی ہو یا اقبال کی، ڈاکٹر خالد ندیم اس حوالے سے ہمیشہ یاد کیے جائیں گے۔

ان کی ادائے ناز کی ایک خاص بات یہ ہے کہ وہ ہمیشہ مصروفِ کار رہتے ہیں وہ مدام چلتے رہنے میں ہی مشامِ زندگی کا کیف محسوس کرتے ہیں۔عصرِ رواں میں بعض اساتذہ کی کارکردگی اور کشادگی نے امکانات کے قندیل روشن کیے ہیں۔اس چراغ کو روغن اور روشنی فراہم کرنے والوں میں ڈاکٹر خالد ندیم حبیبِ عنبر دست کی حیثیت رکھتے ہیں۔ان میں نافۂ غزال اور یادِ یارِ مہرباں دونوں کی آمیزش موجود ہے۔زیرِ نظر مسودہ میں علامہ کی کارگہی کے خوش گوار نثری پاروں کو بڑے سلیقے سے سنجویا اور سنوارا گیا ہے۔'کلیاتِ نثر اقبال' کو ایک خاص ترکیب سے تیار کیا گیا ہے۔جس میں علمی مباحث ہیں اور ذاتی زندگی کے روز وشب کے احوال وآثار کے اشارے بھی موجود ہیں۔ان نثر پاروں سے علامہ کی ایک منفرد شخصیت کا عرفان ہوتا ہے۔بلکہ علامہ کے فلسفیانہ مباحث کی تشریح وتعبیر کے لیے یہ نثری شہ پارے ناگزیر حیثیت کے حامل ہیں۔یہ کہنا نامناسب نہ ہوگا کہ شعرِ اقبال کی یہ شرح ہیں۔راقم کی نظر میں اقبال کی بعض نثری

تحریروں میں کہیں کہیں وہ نکات ملتے ہیں جو اشعار میں منظوم نہ ہو سکے۔

ڈاکٹر خالد ندیم نے علامہ کی نثری تحریروں کو ان کی مقبول شاعری کے روبرو ایک آئینہ خانے کی تشکیل کی ہے ۔شعری اسالیب سے الگ ہو کر ان کے افکار کی عظمت اور پیغام کی حرمت کا اعتراف کرنا پڑتا ہے۔خطوط وخطبات اور مضامین ومقالات کو اس اہتمام سے مرتب کیا گیا ہے کہ موضوع کے مناسبات اور ان کا تسلسل مربوط اور منظّم صورت میں سامنے آ گیا ہے۔نثری حوالوں سے فکرِ اقبال کے مختلف گوشوں پر گفتگو کے لیے قاری کو بڑی سہولتیں میسر آ گئی ہیں ۔اقبال نے کلیات مرتب نہیں کیا تھا مگر ڈاکٹر صابر کلوری مرحوم نے 'کلیاتِ باقیاتِ شعرِ اقبال' سید مظفر حسین برنی مرحوم نے 'کلیاتِ مکاتیبِ اقبال' اور ڈاکٹر خالد ندیم نے 'کلیاتِ نثرِ اقبال' کو مرتب کر کے اقبالیاتی مطالعہ کو جہانِ دیگر کی آگہی بخشی ہے۔جہانِ امکاں کی بازیابی ابھی باقی ہے۔

اے نکہتِ گل اند کے از رنگ بروں آ

مبصر عبدالحق

تصوراتِ اقبال

پروفیسر لطیف حسین شاہ

صفحات : 283

قیمت : تین سوروپے

پروفیسر لطیف حسین شاہ کاظمی کو مبارک باد پیش کرتا ہوں کہ انہوں نے اقبال کے تصورات کو قلم بند کرنے کی قابلِ ذکر کوشش کی ہے۔ان کی اس کاوش پر راقم کو دگنی مسرت حاصل ہوئی کیونکہ مدتوں بعد مسلم یونی ورسٹی کے شعبۂ فلسفہ کے کسی پروفیسر نے اقبال پر ایک کتاب رقم کی ہے، جو قابلِ ستائش ہے۔ دوسرے یہ کہ پروفیسر موصوف دوسرے شیعہ پروفیسر ہیں جنہوں نے اقبال پر کتاب لکھی اور تحسین وتعریف کی۔ پروفیسر فضلِ امام رضوی کی فکرِ اقبال کی اساس پہلی کوشش تھی۔ جو بہت مختصر اور تشنہ تھی۔ عام طور پر اس مسلک کے بیش از بیش قلم کاروں نے اقبال کو ہدفِ تنقید بنایا ہے۔ پروفیسر سید احتشام حسین جیسے اعتدال پسند نے بھی اقبال کو نہیں بخشا۔ اس پس منظر میں غور فرمائیں تو پروفیسر لطیف حسین شاہ کے لیے جذبۂ احترام بڑھ جاتا ہے اور کتاب کی قدر و قیمت بھی وقیع تر ہو جاتی ہے۔ یہ ان کے مزاج کی انصاف پسندی کی علامت ہے۔ مختلف تصورات کے مباحث میں بھی ان کی میانہ روی قابلِ ذکر ہے۔ بیش تر موضوعات وہی ہیں جو فکرِ اقبال کے تجزیہ میں تکرار کی حیثیت رکھتے ہیں۔ جیسے اقبال اور اسلامی نشاۃ ثانیہ ،اقبال اور سرسید، قرآن مجید فکر اقبال کا ماخذ، مردِ مومن، سرمایہ داری واشتراکیت اور اسلام، انسان دوستی، تصوف، جمالیات وغیرہ۔ اہل بیت کے سلسلے میں تین مضامین ہیں۔ عشقِ رسولؐ، فاطمہ زہراؓ اور حضرت حسینؓ۔ ان میں احترام وعقیدت غالب ہے۔ اور اقبال کے شعری حوالوں سے تصورات کو فروزاں کیا گیا ہے۔ فہرست سازی میں پاسِ ناموس رسالت مآبؐ کا اہتمام نہیں ہے۔ سب سے پہلے بیٹی، پھر نواسے اور آخر میں حضور رسالتِ مآبؐ کا ذکر اقبال اور عشقِ رسولؐ کے ذیل میں لایا گیا ہے۔ خانوادۂ رسولؐ کی تمام نسبتیں آنحضرتؐ کے وسیلے سے ہی محترم ہوتی ہیں۔ کرۂ ارض کی سب سے مقدس ذات حضور رسالت مآبؐ کی ہے اسے کتاب کا سب سے آخری موضوع بنایا گیا ہے۔ راقم اسے غیر ارادی سمجھتا ہے۔ اٹھارہ صفحے پر محیط یہ بہت اچھا مضمون ہے۔ ان برگزیدہ ہستیوں کے ذکر میں احتیاط کی کمی نظر آتی ہے۔ رموزِ بیخودی میں فاطمہ زہراؓ پر لکھی گئی نظم کے دس اشعار کا انتخاب کیا گیا ہے، اور ان کا اردو ترجمہ کو کب

شادانی کے حوالے سے پیش کیا گیا ہے۔ ترجمے میں ایک شعر کا ترجمہ غائب ہے۔ وہ شعر ہے

آں یکی شمعِ شبستان حرم　　حافظ جمعیتِ خیرالامم

ذرا ترجمہ کی نوعیت بھی ملاحظہ ہو

اقبال کا شعر ہے

مادرِ آں مرکزِ پرکارِ عشق　　مادرِ آں کارواں سالارِ عشق

کوکب شادانی کا ترجمہ دیکھے۔

ایک بیٹا مرکز پرکارِ عشق　　راہِ حق میں کارواں سالارِ عشق

ماں کی جگہ بیٹے کو پرکارِ عشق کہنا موزوں نہیں ہے۔

اقبال کے شعر میں بیٹا اور راہِ حق کا ذکر نہیں ہے۔ مترجم کی کوشش مستحسن نہیں اور نقل کرنے والے پروفیسر پر بھی افسوس ہوتا ہے جنھوں نے جابجا غیر ضروری حوالوں سے کتاب کی افادیت مشکوک بنادی ہے صفحہ ۱۰۷ پر چادرِ زہراؓ کے ذکر میں پروفیسر وحید اختر کے لکھے گئے مرثیے کے بندوں کو نقل کرنا بھی غیر موزوں ہے۔ پروفیسر موصوف دوسروں کے ترجموں پر تکیہ نہ کرتے تو بہتر تھا۔ ان کا اپنا نثری ترجمہ کہیں اچھا ہوتا۔

اسی طرح صفحہ ۱۰۸ کا ایک دوسرا ترجمہ دیکھئے۔

اقبال کا شعر ہے:

مزرعِ تسلیم را حاصل بتولؓ　　مادراں اسوۂ کامل بتولؓ

مزرعِ تسلیم کا دل ہیں بتولؓ　　ماؤں کو ایک درس کامل ہیں بتولؓ

حاصل کو دل اور اسوۂ کو درس کہنا مناسب نہیں ہے۔ صفحہ ۱۱۰ اور ۱۱۱ پر پروفیسر وحید اختر کے اشعار نقل کیے گئے جس کی چنداں ضرورت نہ تھی کیونکہ یہ مضمون اقبال پر ہے وحید اختر پر نہیں۔ صفحہ ۱۱۲ اور ۱۱۳ پر بھی وحید اختر کے بارہ اشعار بلاضرورت متن میں شامل کیے گئے ہیں۔ ایسا لگتا ہے کہ اقبال کا نام لے کر پروفیسر وحید اختر کو پیش کرنا چاہتے ہیں۔ یہ ارادت مندی تنقید کے منافی ہے۔ صفحہ ۱۱۵ پر بھی شعر اقبال کے ترجمے میں بے راہ روی برتی گئی ہے۔ صفحہ ۱۱۶ پر علامہ کے سات فارسی اشعار نقل کیے گئے ہیں اور صفحہ ۱۱۷ پر ڈاکٹر وحید اختر کا ترجمہ بھی نقل کیا گیا ہے۔

اقبال کا شعر

فطرت تو جذبہ ہا دارد بلند　　چشم ہوش از اسوۂ زہراؓ مبند

ترجمہ ہے

اپنی فطرت دیکھ پھر دنیا کو دیکھ　　چشم دل سے اسوۂ زہراؓ کو دیکھ

اقبال کہتے ہیں کہ تیری فطرت بلند جذبوں کی حامل ہے۔اسوۂ زہراؓ کی پیروی سے اپنی ہوش مند نگاہوں کو بندمت کرو۔ترجمے کے اس فرق پر پروفیسر لطیف حسین شاہ کو نظر رکھنی چاہیے تھی۔اس لیے کہ محترم عنوان کا بھی تقاضا تھا کہ پاس احترام کا لحاظ رکھا جائے۔اس مضمون کے لیے ۱۴ صفحے صرف کیے گئے ہیں۔اس میں ۴۷ اشعار نقل کیے گئے ہیں۔گویا ہر صفحے پر پانچ اشعار درج کیے ہیں۔شعری حوالوں کی یہ کثرت کتاب کے تاثرات کو کم کر دیتی ہے۔ہم توقع کرتے ہیں کہ فلسفہ کے استاد کی برسوں کی بصیرت اور مطالعۂ فکر کا حاصل صفحۂ کاغذ پر فروزاں ہو کر فرزانگی بخشے۔

ان کے علاوہ اقبال کے شعری متن کے ساتھ جو سلوک کیا گیا ہے وہ کسی حال میں بھی قابل معافی نہیں ہے۔ اقبال پر کوئی ایسی کتاب راقم کی نظر میں نہیں ہے جس میں تحریف متن کی ایسی نازیبا مثالیں موجود ہوں۔لگتا ہے کہ یادداشت پر اعتماد کیا جو یاد تھا لکھ دیا۔راقم کی تحریروں میں بھی کئی جگہ اس سہو کی مثالیں موجود ہیں ان پر ندامت بھی ہے۔ہمیں صرف یادداشت پر تکیہ نہیں کرنا چاہیے۔صحت متن کا خاص خیال پیشِ نظر رہے تو اچھا ہے۔شاید پروفیسر لطیف شاہ نے پروف خود نہیں پڑھا دوسروں کے حوالے کر دیا یا کمپوزر سے باز پرس نہیں کی۔کتاب میں نقل کردہ کافی اشعار غلط متن کے ساتھ درج ہیں۔کچھ مثالیں درج ذیل کی جاتی ہیں۔

کتاب میں منقول دوسرا شعر ہے: ترے ضمیر کی جگہ تیرے ضمیر درج ہے۔شعری وزن برقرار نہیں رہتا۔

کتاب کا تیسرا شعر فارسی شعر کا ترجمہ ہے۔

چاہتا ہے گر مسلماں زندگی　　کچھ نہیں ہے جز بہ قراں زندگی

فارسی متن ہے۔

گرتو می خواہی مسلماں زیستن　　نیست ممکن جز بہ قراں زیستن

صفحہ ۶۵ پر اسی شعر کا دوسرا بدلا ہوا ترجمہ دیا گیا ہے۔

چاہے گر مثل مسلماں زندگی　　کچھ نہیں ہے جز بہ قراں زندگی

نیست ممکن کا ترجمہ کچھ نہیں ہے غیر موزوں ہے۔

صفحہ ۱۳ پر طلسم کی جگہ ظلم رقم ہو گیا ہے۔

خودی سے اس ظلم رنگ و بو کو توڑ سکتے ہیں

صفحہ نمبر ۱۴ پر تری کی جگہ تیری ہے

تیری خودی کی نگہباں نہیں تو کچھ بھی نہیں

صفحہ ۲۷ پر مشہور شعر کا غلط متن ملاحظہ ہو

اگر او بہ نرسی دیں تمام بولہبیست

صفحہ ۲۹ پر ہوس کی امیری ہوا کی وزیری میں ہوس کی جگہ ہوا درج ہو گیا ہے۔

صفحہ ۳۳ پر غلط مصرع ہے　　مومن ہے تو آپ ہی تقدیر الٰہی

صحیح مصرع ہے۔　　مومن ہے تو وہ آپ ہے تقدیر الٰہی

صفحہ ۴۷ کا آخری شعر ہے　　اٹھ کہ اب دور جہاں کا اور ہی انداز ہے

بزم کی جگہ دور غلط ہے۔

صفحہ ۴۸ کے شعر کا مصرع ثانی ہے　　عجب نہیں کہ جو چار سو بدل جائے

جو غلط ہے جو کی جگہ یہ صحیح ہے۔ صفحہ ۴۵ پر بڑی مضحکہ خیز صورت ہے۔ مصرع اولیٰ مصرع ثانی میں تبدیل ہو گیا ہے اور ثانی الٹ گیا ہے،

جہاں میں عام ہے قلب ونظر کی رَنجوری

نہ مشرق اس سے بَری ہے نہ مغرب اس سے بَری

متن میں تحریف کی ایسی ناروا مثالیں کسی استاد کے شایان نہیں ہیں۔ جب کہ صفحہ ۵۰ پر یہی شعر درست لکھا گیا ہے۔ تحریف متن کی ایک اور بھونڈی مثال ملاحظہ ہو۔ صفحہ ۵۵ پر مصرع ہے

نائب حق دو جہاں بودن خواہش است

جب کہ صحیح ہے

نائبِ حق در جہاں بودن خوش است

در کا دو خوش کا خواہش میں تبدیل ہو جانا بوالعجبی ہے۔

صفحہ ۵۷ پر مشہور مصرع کی درگت ہو گئی ہے

قرعۂ فال بنامِ من دیوانہ نہ دندم

صحیح مصرع کی یہ صورت ہے۔

قرعۂ فال بنام من دیوانہ زدند

صفحہ ۵۸ پر دوسرے شعر میں گیرد کی جگہ گیر لکھا گیا ہے۔

اسی طرح صفحہ ۷۰ پر رومی کے اشعار بھی بدنمائی سے دوچار ہوئے ہیں۔ صفحہ ۸۱ پر گرچہ کی جگہ اگرچہ موجود ہے۔

اس طرح کی غلطیاں ایک علمی کتاب کی پیش کش کو مجروح کرتی ہیں اور استفادے کی راہیں مسدود ہوتی ہیں۔ یہ چند مثالیں تھیں۔ پوری کتاب کا احاطہ نہ کر سکا۔ کتاب کے آخری اشعار بھی غلط خاتمے کی نشان دہی کرتے ہیں۔ صفحہ ۲۷۸ پر پیغمبر آخرالزماںؐ کی شان میں کہے گئے اشعار میں غلطی ہائے متن ناقابلِ برداشت محسوس ہوتے ہیں۔

یہ جہاں کیا چیز ہے کیا لوح وقلم تیرے ہیں

مصرع میں پہلا کیا زائد ہے دوسری بار بھی اس مصرع کو اسی طرح غلط طور پر رقم کیا گیا ہے

اگر بہ اوز سیدی تمام بولہب یاست

مذکورہ بالا مصرع کتاب کا آخری مصرع ہے اور غلط ہے

مصنف کی کیا مجبوری تھی کہ وہ کمپوزنگ اور متن پر توجہ نہ دے سکے۔ ہر تحریر میں متن کی صحت وثقاہت سب سے اہم ہوتی ہے۔ نتائج کا دارومدار متن سے ہی متعین ہوتا ہے خواہ وہ فکری ہو یا اسلوبیاتی، تاریخی حقائق ہوں یا ایمان ویقین کے مبارک دستاویز۔ ان ظاہری یا صوری لغزشوں سے قطعِ نظر معانی کے اعتبار سے کتاب کے مندرجات مفید اور وقیع ہیں۔ بعض مباحث فکری اور پیچیدہ ہیں مگر مصنف نے انھیں عام سہولت کے لیے آسان بنا دیا ہے۔ پیش نظر کتاب کے مطالعہ سے پروفیسر لطیف حسین شاہ کی اقبال شناسی پر رشک آتا ہے کہ فلسفہ وفکر کے ساتھ اقبال جیسے عبقری مفکر سے بھی ان کی شناسائی ہے۔ اس تعلق میں فلسفہ کی تدریس کے علاوہ ارضِ کشمیر اور علی گڑھ کو بھی دخل ہے۔ یہ امر باعثِ مسرت ہے کہ مسلم دانش گاہ کے علمی گہوارے میں پروفیسر سید محمد ہاشم، پروفیسر لطیف حسین شاہ اور قابلِ احترام پروفیسر عبدالرحیم قدوائی اقبال شناسی کی نمائندگی کر رہے ہیں۔ جو کسی حیرتِ فارابی سے کم نہیں ہے۔

عبدالحق

اقبال کے فکر وفن کا گراف

ڈاکٹر رؤف خیر

صفحات : 236

قیمت : 300

مبصر : حافظ محمد اختر

ڈاکٹر رؤف خیر ایک مقبول شاعر، معتبر نقاد اور محترم استاد ہیں۔ وہ عظیم شاعر علامہ اقبال کے فکر وفن کے ادا شناس ہیں۔ ان سب سے بڑھ کر وہ تفکیر دینی پر بھی نظر رکھتے ہیں۔ اقبال پر ان کی یہ دوسری کتاب ہے جو میرے مطالعہ میں ہے۔ اس سے قبل 'اقبال بہ چشمِ خیر' شائع ہوئی تھی۔ پیشِ نگاہ ان کے مطبوعہ مضامین کا دوسرا مجموعہ ہے۔ حیرت ہوتی ہے کہ انھیں کتاب کا نام رکھنے کے لیے انگریزی لفظ کا سہارا لینا پڑا۔ یہ بے جوڑ نام اچھا نہیں لگتا وہ زبان شناس ہیں اور تخلیق کار بھی ہیں۔ انھیں زیب نہیں دیتا کہ اقبال سے متعلق کتاب کا اٹ پٹا نام رکھیں۔ اردو میں اس کے بہت سے متبادل ہیں۔ ان کے مضامین میں بھی کہیں کہیں یہ کج روی دیکھی جاسکتی ہے۔ وہ چونکا دینے والی باتوں پر شاید زیادہ یقین رکھتے ہیں۔ ایسے ہی گوشے وہ تلاش کرتے ہیں۔ جس میں کسی حد تک تحقیق ہوتی ہے۔ مگر سنجیدگی نہیں ملتی۔ اس کی وجہ ہے تحریروں میں تاثر نہیں قائم ہو پاتا۔

زیرِ تبصرہ میں ایک صفحہ 93 پر حضرت مریم علیہا السلام پر اپنی تخلیق کردہ ایک طویل نظم شامل کردی ہے اسے اقبال کی بے خودی کو نذر کیا گیا ہے۔ نذر کی عبارت قوسین میں ہے۔ یہ بے اعتدالی علمی کتاب کے شایانِ شان نہیں ہے۔ اسی طرح صفحے کے صفحے اقبال کے اشعار سے پُر ہیں۔ جیسے صفحہ ۱۴، ۱۶، ۲۵، ۲۶، ۳۰، ۳۱، ۳۲، ۳۴، ۳۶، ۳۷، ۳۸، ۴۴ اور ۴۵ حوالوں سے پُر ہیں۔ علمی تحریر کے لیے کثرتِ حوالہ پسندیدہ بات نہیں ہے۔ ڈاکٹر روفِ خیر نے جگہ جگہ تحقیقی اندازِ نظر اپنایا ہے۔

یہ مختصر مضامین ہیں۔ اور نفسِ موضوع کی ترجمانی میں جامعیت رکھتے ہیں وہ اعلیٰ تدریس سے وابستہ رہے ہیں۔ شاید اسی لیے تنقید میں طلباء کی تدریسی ضرورتوں کو مدِ نظر رکھ کر انھیں قلم بند کیا گیا ہے ان کی افادیت مسلم اور معتبر ہے۔ یہ اچھی بات ہے کہ وہ ہمیشہ اپنی تحریروں سے شائقین کو نوازتے رہتے ہیں اور استفادے کے لیے علمی چراغ روشن رکھتے ہیں۔ ہم توقع کرتے ہیں کہ تخلیق وتدریس کے تجربے سے کوئی بڑا علمی کام منظرِ عام پر آئے گا۔ پیشِ نگاہ کتاب کے مندرجات اقبال شناسی میں دل کشا مطالعے اور فروغِ نظر میں معاون ہوں گے۔

عذرا بک ٹریڈرس کی نئی مطبوعات

اقبال اور آرزوئے انقلاب

پروفیسر عبدالحق

قیمت : تین سو روپے

اقبال کی فکری سرگزشت

پروفیسر عبدالحق

قیمت : تین سو روپے

سوز و گدازِ زندگی

پروفیسر عبدالحق

قیمت : تین چار سو روپے

پروفیسر عبدالحق کی تحقیقی و تنقیدی خدمات

ڈاکٹر عامر محمود اسلام آباد

قیمت : تین سو روپے

غالب اور غالبیات

پروفیسر عبدالحق

قیمت : تین سو روپے